بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب پڑھنے کی دعا (اول آخر ایک بار درود شریف پڑھیئے)

اَللّٰھُمَّ افْتَحْ عَلَیْنَا حِکْمَتَکَ وَانْشُرْ عَلَیْنَا رَحْمَتَکَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَام

اے اللہ ہم پر علم و حکمت کے دروازے کھول دے اور ہم پر اپنی رحمت نازل فرما اے عظمت اور بزرگی والے۔ (آمین)

اردو نوٹز برائے جماعت نویں

جماعت نویں

اردو

غمگین شیراز ڈار

نوگام چرار شریف

ایم۔ اے اردو، بی ایڈ

9th Class Urdu Notes

Prepared By Gumgeen Sheraz Dar

Nowgam- Charar-i- Sharief -

(7889726757)

Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief

نوٹ:۔ اگر کسی بھی نوٹ میں کوئی غلطی یا خامی وغیرہ ہوں تو براہ کرم تنقید نہ کریں اصلاح کریں کیوں کہ میں بھی ایک انسان ہی ہوں کوئی فرشتہ نہیں ہوں کہ غلطی نہ ہو سکے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔۔۔۔

والسلام۔۔۔

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar M.A B.Ed 7889726757

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar M.A B.Ed 7889726757

Scanned with CamScanner

”حصۂ نثر“

سیرت

سیرت کے لغوی معنی ~~ہیں~~ ”وصف، ہنر، طریقہ یا راستہ کے ہیں۔ یہ لفظ زندگی کے حالات و واقعات کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ زندگی کے بارے میں جو کچھ کہا یا لکھا جاتا ہے اسے بھی سیرت کہتے ہیں۔ یہ سیرت پاک ایمان والوں کے لیے، زندگی گزارنے کے نمونے کا کام دیتی ہے اور یہ زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی کرتی ہے۔ اسلام کے آغاز سے لے کر آج تک حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک پر بہت کچھ تحریر کیا گیا اور بہت سی کتابیں شائع بھی ہوئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش، جائے پیدائش، زمانہ بعثت، ہجرت، غزوات اور وفات سمیت سے متعلق ایک ایک بات اور عمل کو سیرت کی کتابوں میں محفوظ کیا گیا۔ آپ کی سیرتِ پاک تمام دنیا کے لئے قابلِ تقلید و رہنمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ کسی بھی فرق و امتیاز کے بغیر ہر ایک کے لئے باعثِ ہدایت اور روشنی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ جو بھی تعلیمات انسانوں کے سامنے پیش فرمائی پہلے اُن پر خود عمل فرمایا ہے۔

اردو زبان میں جن علما اور ادبا اور سیرت نگاروں نے سیرتِ پاک پر لکھا ان میں مولانا شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، محمد سلیمان منصور پوری، ابوالحسن علی ندوی، ابوالکلام آزاد، ماہر القادری ~~احم~~ نعیم صدیقی اور خواجہ غلام السیدین قابلِ ذکر ہیں۔

———✗———

خواجہ غلام السیدین

حالاتِ زندگی:۔

خواجہ غلام السیدین ۱۹۰۴ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خواجہ غلام الثقلین تھا جو الطاف حسین حالی کے نواسے تھے۔ میٹرک سے بی۔اے تک ہر امتحان میں صوبے میں اول آئے۔ حکومت نے انڈین سول سروس کا امتحان پاس کرنے کے لئے انگلستان بھیجا لیکن آپ نے حاکم بننے کے بجائے استاد بننا پسند کیا۔ انگلستان سے ہی ایم۔ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ وطن واپس آکر علی گڑھ یونیورسٹی کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ پھر ٹیچرس ٹریننگ کالج کے پرنسپل کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے علاوہ کشمیر میں بھی ناظم تعلیم کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں بھی مشیرو پروفیسر کے فرائض انجام دئے ہیں۔ بالآخر ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو علی گڑھ میں انتقال کیا اور جامعہ نگر کے قبرستان میں دفن کئے گئے۔

ادبی کارنامے:۔

خواجہ غلام السیدین ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے دنیا بھر میں مشہور تھے۔ تحریر و تقریر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ آپ کی تحریریں زیادہ تر انگریزی زبان میں ہیں۔ اردو میں روحِ تہذیب، آندھی میں چراغ، اصول تعلیم وغیرہ آپ کی مشہور تصانیف ہیں۔ قول و فعل دونوں کی حیثیت سے وہ ایک سچے استاد تھے۔ آپ کی طبیعت میں شیرینی اور مزاج میں خلوص تھا۔ استاد ہونے کے ساتھ ساتھ آپ ایک شیریں بیان مقرر بھی تھے۔

Scanned with CamScanner

14 Monday JUL 2014

سوالات :- انسانِ کامل

سوال 1 :- حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی کے ابتدائی دور میں کن مشکلات سے سابقہ پڑا؟
جواب :- حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو زندگی کے ابتدائی دور میں طرح طرح کی مشکلات سے سامنہ کرنا پڑا۔ ولادت سے پہلے ان کے والد حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ چھ سال کی عمر میں ان کی والدہ ماجدہ حضرت سیدنا آمنہ رضی اللہ عنہا وصال فرماتی ہے۔ دو سال دادا حضرت عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی سایۂ شفقت میں رہے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرپرستی آپ کے چچا حضرتِ ابوطالب نے کی۔ اس طرح آپ کی ابتدائی زندگی بہت ہی کٹھن حالات میں گزری۔

سوال 2 :- کن خصوصیات کی بنا پر حضرتِ خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے متاثر ہوئے؟
جواب :- حضرتِ خدیجہ رضی اللہ عنہا ایک بیوہ عورت تھی۔ انہوں نے اپنی تجارت کا کاروبار آپ کے سپرد کیا جسے آپ نے پوری دیانتداری اور امانتداری سے نبھایا جس کی وجہ سے یہ عورت بے حد متاثر ہوئی اور اپنی طرف سے شادی کا پیغام بھی بھیجا۔

سوال 3 :- معرفتِ الٰہی اور خدمتِ خلق کی وضاحت کیجیئے؟
جواب :- معرفتِ الٰہی دو لفظوں کا مرکب ہے۔ معرفت اور الٰہی۔ معرفت کے معنی شناخت یا پہچان اور الٰہی اللہ تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے جس کے معنی اللہ تعالیٰ کو پہچاننا یا خداشناسی کے ہیں۔ خدمتِ خلق بھی دو لفظوں کا مرکب ہے خدمت یعنی سیوا یا نوکری کرنا خلق یعنی اللہ تعالیٰ کے بندے جس کے معنی لوگوں یعنی اللہ تعالیٰ کے بندوں کی سیوا کرنا یا نوکری کرنے کے ہیں۔

سوالات :- انفارمیشن ٹیکنالوجی

سوال 1 :- ابتدائی دور کے انسان کی زندگی کیسی تھی؟
جواب :- ابتدائی دور کے انسان کی زندگی لاعلمی اور بے خبری میں گزری ہے۔ وہ دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرتا تھا۔ اس کی آنکھوں نے جو چیزیں دیکھی ہو گی اور ان کے کانوں نے جو آوازیں سُنی ہو گی۔ اس کے بغیر ہر چیز اور ہر آواز کو وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور سُنتا ہو گا اور گھبراتا ہو گا۔

سوال 2 :- آج کے عہد کو "انفارمیشن ٹیکنالوجی کی صدی" کیوں گیا ہے؟
جواب :- آج کے عہد کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ساتھ اس لئے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ریڈیو ٹیلی ویژن اور کمپیوٹر کی بدولت ہم دنیا بھر میں رونما ہونے والے واقعات

Scanned with CamScanner

کو گھر بیٹھے اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور اپنے کانوں سے سنتے بھی ہیں۔ آج ہمارے پاس جو بھی چیزیں ہیں جن سے ہم طرح طرح کے فائدے اٹھاتے ہیں۔ ان ہی ایجادات کی بدولت دنیا ایک چھوٹے گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے۔

سوال 3:۔ ہماری زندگی میں ٹیلی ویژن کی کیا اہمیت ہے؟

جواب:۔ آج کے دور میں ٹیلی ویژن ہماری زندگی کا اہم ترین حصّہ بن چکا ہے۔ اس کے بے شمار چینلوں کے ذریعہ ہم پوری دنیا سے جڑے رہتے ہیں۔ دنیا بھر میں ہونے والے واقعات ہم گھر بیٹھے ٹیلی ویژن کے ذریعے دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ ہمیں ہر وقت ٹیلی ویژن کے ذریعے موسم کی جانکاری حاصل ہوتی ہے۔ ٹیلی ویژن ہمیں 24 گھنٹے دنیا بھر کے حالات و واقعات کے ساتھ رابطے میں رکھتا ہے۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ٹیلی ویژن کی ہماری زندگی میں بہت اہمیت ہے۔

سوال 4:۔ کمپیوٹر نے ہماری زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا ہے؟ تفصیل سے لکھیے؟

جواب:۔ کمپیوٹر ایک ایسا مشینی آلہ ہے جو مہینوں کا کام منٹوں میں کر سکتا ہے۔ مشکل سے مشکل کام آسانی سے حل کرتا ہے۔ کمپیوٹر آج ہر فرد اور ہر گھر کی ضرورت بن چکا ہے۔ اس کے علاوہ دفتروں، کالجوں، اسکولوں اور دیگر کاروباری کاموں میں کمپیوٹر کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر قسم کے دفاتر اور تجارتی کاموں میں اس کا استعمال ہوتا ہے اس طرح زندگی کے کا ہر شعبہ کمپیوٹر سے متاثر نظر آتا ہے اور دن بہ دن اس کی ضرورت میں اضافہ ہوتا ہے۔

سوال 5:۔ انٹرنیٹ کے کیا فائدے ہیں؟

جواب:۔ انٹرنیٹ مختلف انفرادی نیٹ ورک کا ایک مجموعہ ہے جو ایک بڑا نیٹ ورک قائم کرتا ہے۔ انٹرنیٹ کی مدد سے ہم آج گھر بیٹھے دنیا بھر کی معلومات کم وقت اور کم قیمت میں حاصل کر سکتے ہیں۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اپنے عزیزوں، دوستوں اور رشتہ داروں سے انٹرنیٹ کی مدد سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ تعلیم، کاروبار، موسم یا صحت وغیرہ کے متعلق مشورے دستیاب ہوتے ہیں۔ اخبارات اور رسالوں کا مطالعہ بھی انٹرنیٹ ہی کی بدولت ہو سکتا ہے۔ غرض ہر قسم کی جانکاری اور رہنمائی ہم انٹرنیٹ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

NOTES

سوال 6:۔ ای۔میل سے کیا مراد ہے؟

جواب:۔ ای۔میل الیکٹرانک میل کا مختصر نام ہے۔ اس سے مراد ہے برقی تاروں کے ذریعے پیغامات اور دستاویزات کم وقت میں پہنچانے کا کام سر انجام دیتا ہے۔

Scanned with CamScanner

نذیر احمد ملک

حالاتِ زندگی:-

نذیر احمد ملک ۳۱/ دسمبر ۱۹۵۲ء میں پیدا ہوئے۔ کشمیر یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے لسانیات میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ وہ اس وقت کشمیر یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ علم صوتیات میں انہوں نے میسور سے دو ایڈوانسڈ کورسز بھی پاس کئے۔ انہوں نے ہندوستان کی کئی یونیورسٹیوں کا تعلیمی سفر کیا۔

ادبی کارنامے:-

تدریس، تحقیق اور تنقید نذیر احمد ملک کی دلچسپی کے خاص میدان ہیں۔ چنانچہ ان کے کئی علمی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اردو اور کشمیری زبانوں پر خاصا تحقیقی کام کیا ہے۔ ان کی کتاب "اردو رسم الخط ارتقا اور جائزہ" پر جموں و کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز نے انہیں اسٹیٹ ایوارڈ سے نوازا۔ ایک درجن سے زائد طلبا نے ان کی نگرانی میں ایم۔فل اور پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ تدریس و تحقیق کے ساتھ ساتھ وہ کئی ادبی، علمی و تعلیمی انجمنوں کے ساتھ وابستہ ہے۔

—— x ——

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar M.A B.Ed 7889726757

Scanned with CamScanner

"سوالات" اُردو کہاں پیدا ہوئی

سوال 1:- اُردو اور کشمیری میں شامل چند مشترکہ الفاظ اپنی کاپی پر لکھئے؟

جواب:- اردو اور کشمیری میں شامل چند مشترکہ الفاظ یہ ہیں:- خراب، ثواب، آرام، اگر، مگر، ضروری، محبت، نفرت، اجازت، وجہ، دور، نزدیک، اندر، اللہ وغیرہ

سوال 2:- سوچ کر بتائیے کہ درج ذیل زبانیں کہاں بولی جاتی ہیں؟
کشمیری، ڈوگری، ملیالم، کنٹر، تامل، پنجابی، سندھی۔

جواب:- کشمیری کشمیر میں، ڈوگری جموں میں، ملیالم کیرالا میں، کنٹر کرناٹک میں، تامل تامل ناڈو میں، پنجابی پنجاب میں اور سندھی پاکستان کے صوبہ سندھ میں بولی جاتی ہے۔

سوال 3:- برصغیر ہندو پاک کو زبانوں کا عجائب گھر کیوں کہا گیا ہے؟

جواب:- برصغیر ہندو پاک وہ ملک ہے جہاں لاتعداد چھوٹی بڑی زبانیں بولی جاتی ہیں جو زبانوں کے مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان میں جدید ترین زبانیں بھی ہیں اور قدیم ترین زبانیں بھی ہیں۔ ان ہی زبانوں نے ایک ساتھ رہ کر بہت سی مشترکہ خصوصیات اپنائی ہیں اس لئے برصغیر ہندو پاک کو زبانوں کے عجائب گھر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

سوال 4:- "اردو کہاں پیدا ہوئی" عنوان کے تحت مقالے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اُن کو اپنے مختصر الفاظ میں تحریر کیجیے؟

جواب:- اردو کی جائے پیدائش کے متعلق مختلف اور متضاد نظریات پیش کئے گئے ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی کا نظریہ ہے کہ اُردو دکن میں پیدا ہوئی، سید سلیمان ندوی کے مطابق اردو سندھ میں پیدا ہوئی۔ حافظ محمود خان شیرانی کا کہنا ہے کہ اُردو پنجاب میں پیدا ہوئی اور محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔

دراصل اُردو ایک ملی جلی تہذیب کی پیداوار ہے۔ اُردو محض ایک زبان کا نام نہیں ہے بلکہ ایک تہہ دار اور مشترکہ تہذیبی رنگارنگی کا نام ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

شمیم احمد شمیم

حالاتِ زندگی:-
شمیم احمد شمیم نے ۱۹۳۳ء میں شوپیان کے ناسنور گاؤں میں پیدا ہوئے۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد سرینگر کے ایس۔ پی کالج میں داخلہ لیا۔ بی۔اے کا امتحان پاس کرتے ہی آپ محکمہ اطلاعات میں ملازم ہوگئے اور ماہنامہ 'تعمیر' کی ادارت سونپی گئی۔ یہاں سے اُن کی صحافتی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس زمانے میں آپ نے فکرانگیز تنقیدی مضامین تحریر کئے۔ شمیم احمد شمیم اپنی سیمابی طبیعت کے باعث ملازمت سے مستعفی ہوگئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایل، ایل، بی کا امتحان کر کے سرینگر واپس آکر وکالت کا پیشہ اپنایا۔ آپ ۴۷ سال میں ۱۹۸۰ء میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔

ادبی کارنامے:- شمیم احمد شمیم ایک ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین خاکہ نگار بھی تھے۔ وہ اپنی باریک بینی اور مردم شناسی سے بعض قدآور شخصیات کو محض چند الفاظ میں سمیٹ لینے کا ہنر خوب جانتے تھے۔ شمیم احمد شمیم ملک کی پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ ۱۹۶۴ء میں ہفت روزہ اخبار "آئینہ" نکالا۔ اس اخبار کے کا شمیم احمد شمیم کی حقیقت بیانی کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا مستقل کام "چراغ بیگ" بہت مشہور ہوا۔ ان کے الفاظ کا انتخاب، جملوں کی ترکیب، عبارت کی بندش اور مضامین کی ترتیب سے ان کی تحریر کو واضح اور دلچسپ بناتے ہیں۔

"سوالات" دیوانِ مرحوم کی یاد میں

سوال 1:- مضمون نگار کس تصور سے کانپتا ہے؟
جواب:- مضمون نگار اس تصور سے کانپتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کے عزیز و اقارب، دوست اور رشتہ دار، بیوی بچے اس کو اسی طرح بھلا دیں گے جس طرح اس نے اپنے عزیز ترین دوست عبدالقادر دیوان اور اپنے باپ اور بھائی کو بھلا دیا ہے۔

NOTES

سوال 2:- دیوان صاحب کی شخصیت کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے؟
جواب:- عبدالقادر دیوان شوپیان کے ایک گاؤں چوگام میں پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان میں لڑکوں کی تعلیم اور لڑکیوں کی تعلیم کا گناہِ عظیم سمجھی جاتی تھی۔ اس کے باوجود بھی انہوں نے اپنی تعلیم چوری چھپے جاری رکھی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ دیوان صاحب ایک علم دوست شخصیت تھے۔ انہیں مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ وہ پیشے سے ایک

تاجر تھے۔ ان کا شمار ایسے تاجروں میں ہوتا ہے جو کاروباری دنیا میں بھی دنیا کی گندگی سے پاک و صاف رہتے تھے۔ وہ مذہبی آدمی تھے لیکن زاہدِ خشک نہ تھے۔ انہیں اپنے علاقے کے بزرگوں کی صفِ اول میں جگہ ملی۔ وہ بزرگوں کے ساتھ رہ کر زہد و تقویٰ کی باتیں اور دوستوں کے ساتھ رندانہ گفتگو کرتے تھے۔

سوال 3:۔ تشبیہ کسے کہتے تھے؟

جواب:۔ تشبیہ کے معنی ہے مشابہت دینا۔ یعنی ایک چیز کو دوسری چیز کے مانند یا دوسری چیز کے جیسا سمجھنا ہے۔ تشبیہ میں ایک چیز کو دوسری چیز کی کسی خاص خصوصیت کی وجہ سے مشابہت دی جاتی ہے۔ جیسے۔ پھول جیسا نازک، شیر جیسا بہادر، چاند جیسا خوبصورت وغیرہ۔

"سوالات" ماحولیاتی آلودگی

سوال 1:۔ ماحولیاتی آلودگی سے کیا مراد ہے؟

جواب:۔ اپنے گرد و پیش کے ماحول کا ہونا ہی ماحولیاتی آلودگی ہے۔ ماحولیاتی آلودگی سے ہر ذی جان کی زندگی خطرے میں پڑتی ہے۔

سوال 2:۔ قدرت کے دو انمول تحفے کون سے ہیں؟

جواب:۔ قدرت کے دو انمول تحفے آب و ہوا اور ماحول ہیں۔

سوال 3:۔ جنگلات کی کٹائی سے کون سے خطرات پیدا ہو گئے ہیں؟

جواب:۔ جنگلات جو بارش کے لئے ضروری ہے۔ مٹی کے کٹاؤ کو روکنے میں، یا سیلاب اور دوسری قدرتی آفات سے محفوظ رہنے کے لئے جنگلات ضروری ہے۔ جنگلات کی کٹائی جس پیمانے پر جاری ہے اس سے ہمارے ماحول کا قدرتی توازن بگڑتا جاتا ہے۔ زمین کا کٹاؤ ہوتا ہے اور سیلاب آنے کے خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔ اور ہوا کی غلاظت میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

شوکت تھانوی

حالاتِ زندگی :۔

شوکت تھانوی کا اصلی نام محمد عمر تھا۔ وہ ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام اردو کے مشہور مزاحیہ نگاروں میں آتا ہے۔ گھریلو پریشانیوں کے سبب تعلیم و تربیت میں کافی مشکلات درپیش آئی۔ انگریزی تعلیم کے لیے چرچ مشن اسکول میں داخلہ لیا۔ دسویں کا امتحان گورنمنٹ اسکول سے پاس کیا۔ پڑھائی کے دوران ہی شاعری کا شوق پیدا ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان ~~پاکستان~~ کے روزنامہ "جنگ" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔

ادبی خدمات :۔

شوکت تھانوی بحیثیت مزاح نگار کافی مشہور ہوئے۔ وہ روزمرہ کی باتوں اور واقعات کو اس مزے سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والا بے اختیار ہنس پڑتا ہے شوخی اور ظرافت کے ساتھ تہذیب و اخلاق کا خاص خیال رکھتے تھے۔ شوکت تھانوی نے شاعری کے میدان میں بھی اپنی صلاحیتوں کو آزمایا۔ لیکن وہ مزاحیہ شاعری نہیں بلکہ سنجیدہ غزل گوئی کے زمرے میں آتی ہے۔ ان کی مشہور کتابوں میں، سودیشی ریل، موجِ تبسم، طوفانِ تبسم، شیش محل، جوڑ توڑ، قاضی جی اور کارٹون وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔ ڈراما "لاٹری کا ٹکٹ" ان کی کتاب "ہنسی ہنسائی" سے لیا گیا ہے۔

لاٹری کا ٹکٹ "سوالات"

سوال 1 :۔ منشی جی کو کس کا انتظار تھا؟

جواب :۔ منشی جی کو ڈاکیہ سے تار لانے کا انتظار تھا۔

سوال 2 :۔ منشی جی کیا منصوبے باندھ رہے تھے؟

جواب :۔ منشی جی موٹر گاڑی اور کوٹھی کو خریدنے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔

سوال 3 :۔ ڈاکیہ کیا پیغام لایا تھا؟

جواب :۔ ڈاکیہ تار کے ذریعہ یہ پیغام لایا کہ کل شام بھابی جان نے انتقال فرمایا۔

سوال ۵ :۔ ان کرداروں پر مختصر نوٹ لکھئے :۔ منشی جی ۔ سلیم ۔ ڈاکیہ

جواب :۔ منشی جی :۔ منشی جی اس ڈرامے کا مرکزی کردار ہے۔ اور یہی کردار ڈرامے میں مزاح پیدا کرتا ہے لیکن آخر پر المناک صورت حال سے دو چار ہوتا ہے جب اس کی بیوی کی بھابی کے مرنے کی خبر پہنچتی ہے۔

سلیم :- سلیم منشی جی کا بھائی ہے۔ اور منشی جی کی باتوں پر طنز کرتا ہے۔ جبکہ منشی جی اسکو ڈانٹتا رہتا ہے۔

ڈاکیہ :- ڈاکیہ ڈرامے ڈرامے کا ایک چھوٹا سا کردار ہے۔ وہ کہانی میں صرف ایک بار نمودار ہوتا ہے۔ اور اسی کے آنے پر ڈراما اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے۔

سوال ۵ :- ڈراما "لاٹری کا ٹکٹ" کی پوری کہانی اپنے الفاظ میں لکھیئے؟

جواب :- خلاصہ "لاٹری کا ٹکٹ"

ڈراما "لاٹری کا ٹکٹ" شوکت تھانوی کا لکھا ہوا ہے۔ اس ڈرامے میں کُل پانچ کردار ہیں۔ ۱۔ منشی جی ۲۔ منشی کی بیوی ۳۔ منشی جی کا بھائی (سلیم) ۴۔ ڈاکیہ اور ایک خاموش کردار ۵۔ نسیم شامل ہیں۔ ڈرامے کا مرکزی کردار منشی جی ہے۔ سارا ڈراما اسی ایک کردار کے گرد گھومتا ہے۔ یہ ایک مزاحیہ کردار ہے۔ منشی جی کی آمدنی بہت قلیل ہوتی ہے پھر بھی خیالی منصوبے باندھتا ہے۔ اس کی بیوی ایک گھریلو خاتون ہے جو ہمیشہ چولھا پھونکتی رہتی ہے۔ دونوں کے درمیان ہمیشہ تلخیاں رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے ڈراما دلچسپ اور مزاحیہ بنتا جارہا ہے۔ منشی بیوی سے لاٹری کا ٹکٹ مانگتا ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ آج ڈاکیہ لاٹری کے ٹکٹ کا انعام لے کر آیا ہوگا۔ دونوں کے بیچ نوک جھونک ہوتی رہتی ہے۔ اس دوران سلیم آکر خوشی کا راز پوچھتا ہے۔ منشی جی جواب دیتا ہے کہ ڈاکیہ تار لے کر آیا اور میں لکھ پتی بننے والا ہوں اور میرے سارے خواب پورے ہو جائیں گے۔ موٹر گاڑی، نوکر چاکر، بیٹے کا داخلہ کسی انگریزی اسکول میں کرنے کا سوچتا ہوں۔ آخر سلیم تار پڑھ کر سناتا ہے کہ بھابھی جی کا انتقال ہو چکا ہے اور فوراً آنے کو کہا ہے۔ منشی جی کے سارے منصوبوں پر پانی پھر جاتا ہے اور ساری خوشیاں ماتم میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔

Notes Prepared by Sheraz Ahmad Dar
M.A. B.Ed.

Sunday 06

NOTES

PRINCIPAL
Biscoe Memorial Modern School
... Complex B.K. Pora

Scanned with CamScanner

ڈراما

ڈراما یونانی زبان کے لفظ "ڈراؤ" سے مشتق ہے۔ جس کے معنی "عمل" یا "ایکشن" کے ہیں۔ ہر ملک اور ہر زبان کی تعریف کے مطابق ڈراما انسانی زندگی کی عملی تصویر مانا گیا ہے۔ ڈرامے کی ابتدا نقالی سے ہوئی ہے۔ ڈراما اردو ادب کی اہم ترین اصناف میں شمار ہوتا ہے۔ اس کی اولین تعریف میں یونان کے شہرہ آفاق فلسفی و نقادِ ادب ارسطو کی "بوطیقا" سے ہوئی۔ جس میں وہ ڈرامے کو "انسانی اعمال کی نقل" قرار دیتا ہے۔ اس کے بقول "نقالی انسانی جبلت میں داخل ہیں۔ یہ بچپن سے ہی نظر آتی ہے اور اس کے ارتقائے کمال کا نام ڈراما ہے۔"

مختلف ڈراما نگاروں اور نقادوں نے اس کی الگ الگ تعریفیں کی ہیں:-

۱۔ بقول سرو "ڈراما زندگی کی نقل رسم و رواج کا آئینہ اور سچائی کا عکس ہے۔"

۲۔ بقول وکٹر ہیوگو "ڈراما ایک آئینہ ہے جس میں فطرت منعکس ہوتی ہے۔"

۳۔ جان پال سارتر "ڈرامے کا فن ایسے عناصر کا مجموعہ ہے جن کی مدد سے زندگی کو تھیٹر میں پیش کیا جاتا ہے۔"

۴۔ اعجاز حسین لکھتے ہیں کہ "ڈراما اور اسٹیج کا جو گہرا ربط ہے اس کو سوچ کر یہ کہا جا سکتا ہے ڈراما اپنا خوبصورت طائر ہے اور اسٹیج اس کا پرواز۔ جس کے بغیر طائر بلندی نہیں حاصل کر سکتا ہے۔"

ان تعریفوں سے ڈرامے کی صنفی نوعیت پوری طور پر واضح نہیں ہو جاتی۔

ڈراما فطرت اور انسانی افعال کی نقل کا فن ہے جس میں اداکاروں اور مکالموں کے ذریعے غیر متوقع اور تعجب خیز حالات میں انسانی قوتِ ارادی کا اظہار، تصادم، کشمکش اور عروج و زوال کی صورت میں تماشائیوں کے سامنے ایک معین وقت اور مخصوص انداز میں کیا جاتا ہے۔

فنی اعتبار سے ڈرامے کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، جنہیں ہم پلاٹ، کردار نگاری اور زبان و بیان یا اسلوب سے موسوم کرتے ہیں۔ ڈرامے کے پلاٹ کا گٹھا ہوا ہونا بہت ضروری ہے۔ یعنی اس میں واقعات کی ترتیب اس طرح ہونی چاہئے کہ ایک تو ہر آنے والا واقعہ پہلے واقعے کے ساتھ جڑا ہوا ہونا چاہیے، دوسرا یہ کہ پہلے واقعے سے زیادہ متاثر کرے۔ پلاٹ میں واقعات کی تعداد جتنی کم ہو ڈراما نگار انہیں موثر بنانے کی طرف اتنی ہی زیادہ توجہ دے سکتا ہے۔ کردار نگاری کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تشکیل کرتے وقت کرداروں کی عمر، طبقے، تعلیم و تربیت اور خاندانی خصوصیات کا لحاظ رکھا جائے۔ نہ بچوں کو بزرگوں کی طرح گفتگو کرتے ہوئے دکھایا جائے نہ بزرگوں کو بچوں کی طرح۔

ڈرامے کی زبان کا پرشکوہ، موثر اور ایجاز و ارتکاز کی خصوصیت سے متصف ہونا بھی ضروری ہے۔ اردو میں ڈرامے کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ اس کا آغاز اودھ کے تاجدار علی شاہ کے ہاتھوں ۱۸۴۲ء میں "رادھا کنھیا کا قصہ" کی شکل میں ہوا۔ کچھ مدت بعد اس ڈرامے کی شہرت سے متاثر ہو کر امانت لکھنوی نے "اندر سبھا" کے نام سے ایک تجربہ کیا۔ جس نے اردو ڈرامے کی ترقی کے راستے کھول دئے۔

Scanned with CamScanner

January 2015 | February 2015

Monday 22 DEC 2014 356-009 • WK 52

بیسویں صدی میں سائنسی اور تکنیکی ترقی کی وجہ سے اردو ڈرامے کو مزید فروغ ملا۔ ریڈیو کی ایجاد نے یک بابی ڈراموں کی تخلیق کے سامان پیدا کئے اب ٹی وی نے ٹیلی پلے کی شکل میں ڈرامے کو نئی جہت سے آشنا کیا ہے۔ ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی رو نے بھی اردو ڈرامے کو متاثر کرکے حقیقت پسند یا اشتراکی ڈرامے کے ساتھ ہی ساتھ ایپک تھیٹر اور لایعنی ڈرامے کے تجربوں کو ممکن بنایا۔ اور اس طرح اگر ایک طرف کرشن چندر، منٹو، بیدی، عصمت اور علی محمد لون جیسے فن کار ابھرے ہیں، تو دوسری طرف حبیب تنویر، ڈاکٹر محمد حسن، شمیم حنفی جیسے ماہرین فن نے اردو ڈرامے کو نئے آفاق سے روشناس کیا ہے۔

—★—

Prepared By Gumgeen Sheraz Dar. M.A. B.Ed.

Gumgeen Dar
Nowgam Chrari Sharief 7889726757

پشکر ناتھ

حالاتِ زندگی:-

پشکر ناتھ ۳۱ مئی ۱۹۳۲ء میں سرینگر کے بٹہ یار محلہ میں پیدا ہوئے۔ بی۔اے کرنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی۔ اور ایک مدت تک محکمہ اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازمت کی۔ عمر کا بیشتر حصّہ جموں میں گزارا۔ ناساعد حالات سے مجبور ہوکر ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ پشکر ناتھ ریاست اور بیرون ریاست کے ادبی حلقوں میں بھی اچھی طرح جانے جاتے ہیں۔ پشکر ناتھ کا انتقال جموں میں ہوا۔

ادبی خدمات:-

پشکر ناتھ ایک ترقی پسند ادیب تھے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز ان کے پہلے افسانے "کہانی پھر ادھوری رہی" سے ہوا۔ جو ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ان کی کہانیاں برصغیر ہندو پاک کے بہت سے رسائل اور جرائد میں چھپنے لگے جس کی وجہ سے ان کی شہرت ہندو پاک دونوں ممالک میں ہوئی۔ اس کے دو افسانوی مجموعے "اندھیرے اجالے" اور "گل کے باسی" کافی مشہور ہوئے۔ جس پر انہیں ریاستی کلچرل اکاڈمی کی طرف سے انعامات ملے۔ افسانوں کے علاوہ انھوں نے بہت سے ڈرامے بھی لکھے۔ اپنے ڈکشن پر انہیں مہارت حاصل تھی۔ کشمیر سے تعلق ہونے کی وجہ سے یہاں کے مناظر، پھل پھول، دریا، آب و ہوا اور موسم وغیرہ کا ذکر ان کی کہانیوں میں اکثر ملتا ہے۔ ان کی کہانیوں سے کشمیر کے دکھ درد کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

"سوالات" "درد کا مارا"

سوال 1:- محمد جو نے جانوروں کی کھالوں میں نیا جسم فٹ کرنے کا فن کن سے سیکھا تھا؟

جواب:- محمد جو نے جانوروں کی کھالوں میں نیا جسم فٹ کرنے کا فن اپنے باپ رمضان جو سے سیکھا۔

سوال 2:- محمد جو تھوڑے عرصے میں صاحبِ حیثیت تاجروں میں کیوں شمار ہونے لگا؟

جواب:- یہ محمد جو کی فن کارانہ مہارت کا کرشمہ تھا اس کا انتھک محنت کا نتیجہ تھا اور کچھ اس کی سادگی طبیعت کا اثر تھا کہ تھوڑے ہی عرصے بعد وہ صاحبِ حیثیت تاجروں میں شمار ہونے لگا۔

NOTES

سوال 3:- محمد جو نے چیتے کے بچے کی قیمت کیوں کم کر دی؟

جواب:- محمد جو نے لڑکی کے بار بار دکان کے چکر لگانے سے یہ محسوس کیا کہ شاید اس لڑکی کے پاس اتنے پیسے نہ ہو سکے کہ یہ چیتے کے بچے کو خرید سکے اس لئے انہوں نے اس کی قیمت کم کر دی۔

سوال 4:- انگریز لڑکی نے چیتے کے بچے کی پہلے سے کم قیمت سن کر محمد جو سے کیا کہا؟

جواب:- لڑکی نے چیتے کے بچے کی قیمت کم کرنے پر محمد جو سے کہا کہ "مجھے دیس میں بولا گیا تھا

کہ یہاں سب دھوکے باز ہے یہ بات سچ ہے کیونکہ آپ نے ایک ہی رات میں ٹائیگر کب کی قیمت ایک ہزار کم کردی۔ اور آخر پھر وہ محمد جو سے کہتی ہے کہ پانچ سو میں دینا ہے تو بات کرو۔

سوال ۵:۔ کشمیر میں پائے جانے والے اُن جانوروں، پرندوں اور جھیلوں کے نام لکھئے جن کا ذکر اس افسانے میں آیا ہے؟

جواب:۔ کشمیر میں پائے جانے والے جانوروں کے نام جن کا ذکر افسانے میں آیا ہے:۔

جانور:۔ چیتا، بارہ سنگھا، مارخور، پرندوں کے نام:۔ راج ہنس، مرغیاں، رام چڑیا، بطخ۔ جھیلوں کے نام:۔ جھیل ڈل، جھیل وُلر۔

خلاصہ:۔ درد کا مارا "افسانہ"

یہ افسانہ پشکر ناتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس افسانے کا عنوان ہے "درد کا مارا"۔ افسانے کی کہانی ایک ایک انگریز لڑکی سے شروع ہوتی ہے۔ انگریز لڑکی بار بار محمد جو کے دکان کے سامنے گزرتی ہے۔ محمد جو اس لڑکی کو دیکھ کر مسکراتا ہے۔ لیکن یہی مسکراہٹ پھر اداسی میں بدل جاتی ہے۔ محمد جو سرینگر کے "بنڈ" علاقے میں ہاتھ سے بنائی ہوئی چیزوں کی دکانداری کرتا تھا۔ اس کی دکان کے سامنے سے بہت سے انگریز گزرتے تھے اور وہاں سے مختلف قسم کی چیزیں خریدتے تھے۔ آج ایک لڑکی اس کی دکان سے دو بار گزر چکی تھی۔ اب وہ تیسری بار یہاں سے گزر رہی تھی۔ محمد جو کی دکان میں بہت سی خوبصورت چیزیں بیچنے کے لئے تھی۔ ان میں ایک مصنوعی چیتے کا بچہ تھا۔ یہ چیتے کا بچہ نقش و نگار کرکے اخروٹ کی تپائی پر رکھا ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ چیتے کا بچہ اصلی ہے اور اپنی ماں کا انتظار کر رہا ہو۔ محمد جو کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ آ گئی مسکراہٹ کی وجہ چیتے کا کے اصلی ہونے کا گمان تھا اور انگریز لڑکی کی للچائی نظریں تھی۔ اس کی مسکراہٹ غم میں بدل جاتی ہے کیونکہ لڑکی اس چیتے کے بچے کو خریدنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے۔ جب اس لڑکی نے چیتے کے بچے کا ماڈل دیکھا تو اسے بھی ایسا محسوس ہوا ہوگا جیسے محمد جو کو ہوا تھا۔ یعنی چیتے کا بچہ ایک ٹانگ اوپر اٹھائے اپنا دائیں طرف کا پنجہ آگے بڑھائے گا اور اچھل کر کود پڑے گا۔ لڑکی احتیاط اور ڈرتے ڈرتے دکان میں اس جگہ داخل ہوتی ہے جہاں وہ چیتے کا بچہ رکھا ہوا تھا۔ لڑکی محمد جو سے کہتی ہے کہ یہ ٹائیگر مجھے بہت پسند ہے۔ اس کی کیا قیمت ہے۔ محمد جو ٹائیگر کی قیمت دو ہزار سات سو اسی روپے بتاتا ہے۔ لڑکی کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے ہیں اسلئے وہ دکان سے واپس چلی جاتی ہے کچھ گھنٹوں بعد

Scanned with CamScanner

161

183-182 • WK 27

JUL 2014

02 Wednesday

June 2014

M	T	W	T	F	S	S
30						1
2	3	4	5	6	7	8
9	10	11	12	13	14	15
16	17	18	19	20	21	22
23	24	25	26	27	28	29

July 2014

M	T	W	T	F	S	S
	1	2	3	4	5	6
7	8	9	10	11	12	13
14	15	16	17	18	19	20
21	22	23	24	25	26	27
28	29	30	31			

لڑکی پھر آتی ہے اور محمد جو مسکرا کر کہتا ہے بی بی میں اسے کاسٹ پرائس پر آپ کو
دوں گا۔ خالی سترہ سو اسی روپے۔ لڑکی نے کہا کہ قیمت میں ~~اس قدر کمی~~ ایک دم سے
اس قدر کمی! میں پانچ سو دوں گی لینا ہے تو بات کرو۔ محمد جو ان الفاظ کی تلخی کو
اپنے اندر اترتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ ہمدردی اور نیک نیتی کے باوجود
کبھی لڑکی اس سے کہتی ہے کہ میں نے دیس میں سنا تھا کہ یہاں کے لوگ بے
ایمان اور دھوکے باز ہیں یہ بات سچ ہے۔ محمد جو نے ایک کاغذ کے پرچے پر
چیتے کے بچے کی لاگت کا حساب لکھا تھا وہ اسے کاٹ کر پھینک دیتا ہے۔ بت
کیونکہ اُسے نیک نیتی کے باوجود یہ الزام دھوکے بازی کا برداشت نہیں ہوا۔ اسے
اور ایسا محسوس ~~کرتا ہے~~ کرنے لگا کہ ایک جست میں یہ چیتے کا بچہ اس کے
سینے ~~[illegible]~~ پر سوار ہو کر اپنے نوکیلے دانت اس کی شہ رگ میں پیوست کر کے
اس کا کام تمام کر دے گا۔

——— x ———

افسانہ

انسان کی فطرت ہے کہ وہ کہانی سننا اور کہتا آیا ہے۔ پہلے جب انسان کے پاس وقت کافی تھا تو وہ طویل قصے اور کہانیاں سنتا سناتا تھا لیکن زمانہ بدلتا گیا اور انسان کی فرصتیں پہلی سی نہ رہی اور اس نے انسان کے مسائل کو سمجھنا سمجھانا شروع کیا۔ اس طرح ناول کی شروعات ہوئی۔ ناول نے زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا۔ اس کے بعد مختصر افسانہ وجود میں آیا۔

اردو میں مختصر افسانہ وہی نثری صنف ہے جسے انگریزی میں شارٹ سٹوری کہا جاتا ہے۔ مختصر افسانے کی صنف اردو میں مغرب کے اثرات کی دین ہے۔ مختصر افسانے کی ابتدا انیسویں صدی کے شروع میں امریکہ میں ہوئی۔ وہاں واشنگٹن ارنگ نے "اسکیچ بک" (Sketch Book) لکھ کر مختصر افسانے کا پہلا نمونہ پیش کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ مختصر افسانے کو پڑھ کر قاری کے دل پر ایک خاص کیفیت گزرتی ہے اور یہی مختصر افسانے کی پہچان ہے۔ مختصر افسانے سے مراد نثر میں لکھی گئی ایسی کہانی ہے جس میں انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کو اس طرح پیش کیا جائے کہ قاری کی اس میں دلچسپی پیدا ہو۔ اس میں کسی ایک واقعہ، کسی ایک خیال، ایک احساس، ایک تجربہ کو کم سے کم اور خوبصورت سے خوبصورت لفظوں میں اس ترتیب کے ساتھ پیش کیا جائے کہ شروع سے آخر تک ایک تاثر قائم رہے اور ساتھ ہی ابتدا، ارتقا اور انجام کا بھی احساس رہے۔ اس کے علاوہ کہانی کو دلچسپ بنانے میں تخیل اور جذبے سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ افسانے کی یہ بھی تعریف کی گئی ہے کہ کوئی ایسا بیان جو مکمل ہو اور ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکے۔ افسانے میں ایک یا ایک سے زیادہ کردار ہو سکتے ہیں۔ منظرنامہ، پلاٹ یا مکالمہ بھی ہو سکتا ہے۔ مختصر افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو سے تعلق رکھتا ہے۔ پوری زندگی کے بجائے اس کے کسی ایک گوشے کی جھلک دکھاتا ہے۔ تفصیل اور پھیلاو کے بجائے اس میں اختصار اور ایجاز پایا جاتا ہے۔ اختصار کے معنی یہ ہیں کہ وہ تمام بیانات، کردار، واقعات، مکالمات اور مناظر کہانی میں شامل نہ ہوں جو وحدت تاثر کی راہ میں حائل ہوں اور بنیادی نکتے سے توجہ ہٹا دیں۔

اردو میں مختصر انیسویں صدی کے شروع میں سب سے پہلے پریم چند نے افسانے لکھنے شروع کئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے صنف افسانہ نے ایسی ترقی کی کہ اردو ادب کی مقبول ترین صنف ہو گئی۔ ۱۹۳۲ء میں افسانوں کا ایک مجموعہ "انگارے" شائع ہوا۔ اور باضابطہ طور پر افسانوں کا دور شروع ہوا۔ آزادی کے بعد ہندوستان اور پاکستان میں کئی برس تک فسادات کے موضوع پر بہترین افسانے لکھے گئے اور انسانی قدروں کے زوال نیز تہذیبی اور اخلاقی قدروں کی پامالی کا احساس عام ہوا۔ بدلتے ہوئے حالات اور زندگی کی بڑھتی ہوئی پیچیدگی کے ساتھ ساتھ افسانہ بھی پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں نے اشاروں کی زبان اختیار کی اور بعض نے حقیقت پسندی کے اصول کو اپنا لیا۔ افسانے میں حقیقت نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں علی عباس حسینی، اختر اورینوی، احمد ندیم قاسمی، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس، غلام عباس وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar M.A B.Ed 7889726757

Scanned with CamScanner

ناول

ناول انگریزی زبان کا لفظ ہے اور اطالوی زبان کے لفظ "ناویلا" سے مشتق ہے جس کے معنی "نیا" کے ہیں۔ کہانی کی اس قسم کو یہ نام اسلئے دیا گیا کیونکہ اس کا انداز داستان سے بالکل الگ ہے۔ اصطلاح میں ناول اس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں حقیقی عہد کے پس منظر میں فرد اور سماج کی کشمکش دکھائی گئی ہو۔ ناول انگریزی ادب کے زیر اثر اردو میں آیا۔ اردو ادب کی دوسری بیشتر اصناف کی طرح ناول کی بھی کوئی جامع، مکمل اور حتمی تعریف ممکن نہیں۔ "ناول" اس نثری تحریر کا نام ہے جس میں کوئی ایسی کہانی بیان کی گئی ہو جو زندگی کی ترجمانی کرتی ہو۔ اس میں مختلف کردار ہوتے ہیں جن کے سہارے واقعات آگے بڑھتے ہیں۔ اور مکالمہ نگاری کے ذریعے کرداروں کے درمیان گفتگو کو نقل کیا جاتا ہے اس میں دو کردار "ہیرو" اور "ہیروئن" اہم ہوتے ہیں اور باقی کردار ان کے گرد گھومتے ہیں۔

حقیقت میں ناول اجتماعی یا انفرادی زندگی کی ترجمانی اور تصویر کشی کا نام ہے ایک ایسی کہانی جس کو ناول نویس زندگی کے حقائق سے اخذ کرکے اپنے فکر و خیال سے ایک نئے رنگ اور صورت میں پیش کرتا ہے۔ عام طور پر ناول میں پلاٹ، کردار، مکالمہ، نظریۂ حیات اور منظر نگاری کو شامل کیا جاتا ہے۔ ایسے ناول بھی لکھے گئے جن میں یہ روایتی اجزاء نہیں ملتے۔ پلاٹ، موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ناول کی کئی قسمیں ہیں۔ ناول "المیہ" بھی ہو سکتی ہے اور "طربیہ" بھی۔ وہ ناول جس سے طبیعت کو فرحت حاصل ہو اور اس کا انجام "ہیرو" کی کامیابی پر ہو "طربیہ" ناول کہلاتا ہے۔ اس کے برعکس "المیہ" ناول کا انجام المناک ہوتا ہے اور اس کو پڑھنے کے بعد دل کو تکلیف پہنچتی ہے۔ ناول میں ہمارے مسائل کا حل پیش کیا جاتا ہے۔ ناول پڑھے لکھے اور مہذب انسانوں کی ایجاد ہے۔

۱۹ انیسویں صدی کے نصف آخر میں چونکہ ہندوستان انگریزوں کے ماتحت تھا۔ لہٰذا تعلیم و تہذیب کے اثر سے ہندوستان میں نئی ترقی کے آثار رونما ہوئے۔ اس زمانے میں نذیر احمد اور ان کے ہم عصر ادبا کے ہاتھوں سے ناول کا آغاز ہوا۔ انہوں نے عمدہ اخلاق ساز اور سماج سدھار ناول ہیں لکھی۔ نذیر احمد کے ناولوں میں "مراۃ العروس"، "توبۃ النصوح"، "ابن الوقت"، اور "فسانۂ مبتلا" خاص اہمیت کے حامل ہے۔ اس دور کے دوسرے مصنف رتن ناتھ سرشار ہے۔ ان کا قصہ "فسانۂ آزاد" بہت مقبول ہوا۔ سرشار کے بعد شرر کا نام آتا ہے۔ شرر نے مضمون، تاریخیں اور ناول بھی لکھے۔ مگر وہ ناول نویس کے طور پر مشہور ہوئے۔ شرر کو "اردو والٹر اسکاٹ" کہا گیا ہے۔ سجاد حسین، نواب آزاد اور جوالا پرشاد کے تراجم اردو ناول کی تاریخ میں اہم ہیں۔ مرزا رسوا کے ناولوں سے اردو ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کا ایک مشہور ناول "امراؤ جان ادا" ہے۔ اس ناول سے ان کی فن کاری ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بعد راشد الخیری کا نام قابل ذکر ہے۔ وہ اپنی ناولوں میں عورتوں کی مظلومیت کو بیان کرتے ہیں وہ ناولسٹ سے زیادہ انشا پرداز تھے۔ رسوا کے بعد پریم چند نے بھی اپنی ناولوں میں شہری اور دیہاتی زندگی کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ پریم چند کے بعد قاضی عبدالغفار، عزیز احمد، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر وغیرہ نے بھی ناول لکھے۔

Scanned with CamScanner

کرشن چندر

حالاتِ زندگی:-

کرشن چندر ۲۳ نومبر ۱۹۱۳ء بھرت پور راجستھان میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن وزیر آباد (پاکستان) تھا۔ ان کے والد کا نام ڈاکٹر گوری شنکر چوپڑا تھا۔ کرشن چندر نے آٹھویں جماعت تک اپنی تعلیم پونچھ کے مشہور اسکول وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول میں حاصل کی۔ لاہور سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ گورنمنٹ لاء کالج لاہور سے ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں پہلے ایک اخبار میں صحافی کی حیثیت سے ملازمت کی۔ ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد فلمی دنیا سے منسلک ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں کرشن چندر نے آخری بار اپنے اہل خانہ کے ساتھ پونچھ کا سفر کیا۔ آخر کار ۱۹۷۷ء میں ۶۲ برس کی عمر میں ممبئی میں انتقال کیا۔

ادبی خدمات:-

کرشن چندر کا رجحان بچپن سے میں نثر کے مقابلے میں شاعری کی جانب زیادہ تھا۔ لیکن اُن کے استاد دینا ناتھ رفیق کے مشورے پر انہوں نے شاعری ترک کی اور نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ کرشن چندر کو مطالعے کا اتنا شوق تھا کہ بچپن میں ہی انہوں نے داستان الف لیلیٰ اور رابندر ناتھ ٹیگور کے تمام شاہکار ناول پڑھ لئے۔ انہوں نے میر اور غالب کے علاوہ رُباعیاتِ خیام کو بھی حفظ کر لیا تھا۔ ۱۹۴۳ء میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "طلسمِ خیال" اور ان کا پہلا ناول "شکست" ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔

کرشن چندر کے کچھ اہم ناول یہ ہیں:- جب کھیت جاگے، باون پتے، طوفان کی کلیاں، ایک گدھے کی سرگزشت، غدار، ایک عورت ہزار دیوانے، آسمان روشن ہے، کاغذ کی ناؤ، لندن کے سات رنگ اور میری یادوں کے چنار۔ بچوں کے لئے انہوں نے "چڑیلوں کی الف لیلیٰ" الٹا درخت اور لال تاج جیسے مشہور اور دلچسپ ناول لکھے۔

سوالات "میں ایک شہر تھا پونچھ"۔

سوال 1:- کرشن چندر نے پونچھ کو روم کے ساتھ تشبیہ کیوں دی، وضاحت کیجئے؟

جواب:- کرشن چندر نے ٹیلوں کی وجہ سے اور خوبصورتی کی وجہ سے پونچھ کو روم کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ کیونکہ روم اور پونچھ خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ ٹیلوں پر آباد ہے۔ روم سات ٹیلوں پر آباد ہے اور پونچھ بارہ ٹیلوں پر آباد ہے۔

سوال 2:- کرشن چند اپنے والد کے ساتھ شاہی محل کیوں گئے تھے، اور وہاں کیا واقعہ پیش آیا؟

جواب:- کرشن چندر کا باپ ایک ڈاکٹر تھا۔ وہ شاہی محل میں راجا کی علاج کے خاطر گئے تھے۔ وہاں راجکمار اور ان کے ساتھی آپس میں کھیلتے تھے اور ایک دوسرے کو اپنی اپنی چیزیں دکھاتے تھے۔ جب کرشن چندر نے اپنا وزیر آبادی چاقو دکھایا تو انہوں نے اس سے وہ چاقو لیا کا اُسے کافی مارا پیٹا جس کا دکھ کرشن چندر کو ساری عمر رہا۔

Scanned with CamScanner

خلاصہ:۔ "میں ایک شہر تھا۔۔۔۔۔پونچھ"

"میں ایک شہر تھا پونچھ" کرشن چندر کے سوانحی ناول "مٹی کے صنم" سے ماخوذ ایک حصّہ ہے۔ان کے والد ایک ڈاکٹر تھے۔انہوں نے پونچھ میں برسوں تک اپنے فرائض انجام دئے۔ اس ناول میں کرشن چندر ایک ایک چیز اور ایک ایک جگہ کا مقابلہ دنیا کی دوسری چیزوں اور جگہوں سے کرتے ہیں لیکن ہر بار انہیں پونچھ ہی خوبصورت نظر آتا ہے۔اس ناول میں کرشن چندر پونچھ کا مقابلہ ممبئی کی تیز رفتار زندگی کے ساتھ کرتے ہیں۔اس میں کرشن یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ کچھ چیزیں زندگی میں ایسی ہوتی ہیں جنہیں ایک بار گنوا دیا تو دوبارہ کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ناول نگار نے اپنا بچپن پونچھ میں گزارا اور بچپن کی یادیں تازہ کرتے ہوئے اپنے کھیلنے اور پڑھنے کا حال لکھتے ہیں کہ کیسے وہ میدان میں کھیلتے تھے اور پیاس لگتے ہی دریا میں منہ ڈال کر پانی پیتے تھے۔ایک بار انہیں راجکماروں کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملتا ہے لیکن اسی دن اپنی زندگی کی سب سے خوبصورت چیز کو گنوا دیتا ہے جس کے دکھ نے اسے قلمکار بنا دیا۔

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar.M.A B.Ed.7889726757

Scanned with CamScanner

مرزا اسداللہ خان غالب

حالاتِ زندگی:-

اسداللہ خان نام غالب تخلص تھا۔ 1797ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبداللہ بیگ اور والدہ کا نام عزت النساء تھا۔ ان کے دادا شاہ عالم کے زمانے میں ایران سے ہندوستان آئے ان کے خاندان کو ملک میں مناسب مرتبہ ملا۔ غالب پانچ سال کے تھے جب والد کا انتقال ہوگیا اس کے بعد اُن کی پرورش ان کے چچا مرزا نصراللہ بیگ نے کی۔ چار سال بعد اُن کا بھی انتقال ہوگیا اور گھر میں مرزا کا کوئی سرپرست نہ رہا۔ تیرہ سال کی عمر میں غالب کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے دلی میں ہوئی۔ 1857ء میں مرزا کو بڑی صعوبتیں جھیلنی پڑی۔ غالب کے آخری دن لمبی بیماری کی وجہ سے تکلیف میں گزرے لیکن ان کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ غالب کا انتقال 1869ء میں دہلی میں ہوا۔

شاعرانہ خصوصیات:-

غالب کو اردو کے بڑے شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ فارسی شاعری میں بھی اُن کا مرتبہ بلند ہے۔ زندگی کے ایک بڑے حصے میں انہوں نے اردو میں بہت کم کہا۔ یوں تو غالب اپنے فارسی کلام کو سرمایۂ افتخار سمجھتے تھے مگر زمانے نے قبولیت عام کا تاج ان کی اردو شاعری کے سر پر رکھا۔ اُن کا اردو غزلوں کا دیوان جس میں کُل اٹھارہ سو اشعار ہے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ غالب بات کو ایک اچھوتے انداز میں بیان کرتے ہیں اور معمولی مضمون کو بھی شعر میں انوکھے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی مرحلہ ایسا نہ ہوگا جس پر ہم غالب کے کسی نہ کسی شعر کے ذریعے اظہار رائے نہ کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں جتنے شعر ضرب المثل ہوگئے ہیں ان میں سب سے زیادہ اشعار غالب کے ہیں۔

بلاشبہ غالب ایک ایسے عظیم اور بلند پایہ شاعر ہیں جو اردو ادب کی دنیا پر آج بھی غالب ہیں۔ انہوں نے اردو نثر و نظم میں ایک الگ راہ نکالی۔ انہوں نے نہ صرف اپنے دور کو متاثر کیا بلکہ آنے والی نسلیں بھی ان سے فیض حاصل کرتی رہیں گی۔

NOTES

Notes prepared by مقلین شیراز ڈار

Gumgeen Dar
Nowgam Ehrari Sharief

غالب کے خطوط

سوالات :-

سوال 1 :- غالب کی خطوط نگاری پر پانچ جملے لکھیئے ؟

جواب :- غالب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ نثر نگار بھی تھے۔ غالب کی خطوط نگاری منفرد اور نرالی ہے۔ انہوں نے اردو ادب میں ایک نیا طرزِ تحریر ایجاد کیا۔ غالب نے اردو مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔

۱۔ غالب اپنے خطوط میں عام اور بالکل بول چال کی زبان استعمال کرتے تھے۔

۲۔ غالب اپنے خطوط میں عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال احسن طریقے سے کرتے تھے۔

۳۔ غالب کے خطوط میں ظرافت اور شوخی پائی جاتی ہے۔

۴۔ ہنسی مذاق بھی غالب کے خطوط کا اہم جز ہے۔

۵۔ غالب کے خطوط میں غالب کے زمانے کی عکاسی پائی جاتی ہے۔

سوال 2 :- غالب نے رام پور کی تعریف میں کیا کہا ہے ؟

جواب :- غالب نے رام پور کی تعریف میں بہت کچھ کہا ہے۔ کہتے ہیں کہ رام پور دارالسرور ہے اور بہت خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں کا پانی حیات بخش اور میٹھا ہے۔ اور یہاں کے لوگ ہمدرد، علم دوست اور مہمان نواز ہیں۔

سوال 3 :- اپنے دوست کو خط لکھیئے جس میں خط نہ لکھنے کی شکایت کی گئی ہو ؟

جواب :-

راولپورہ سرینگر
۰۲/ اگست ۲۰۲۳ء

پیارے دوست

میں خیریت سے ہوں اور امید ہے کہ آپ بھی بخیر و عافیت ہونگے۔ دو مہینوں سے آپ نے میرے کسی خط کا جواب بھی نہیں دیا۔ کیا وجہ ہے کہ آپ نے خط لکھنے کا سلسلہ بند کر دیا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ کوئی ناراضگی ہے یا کوئی اور بات ہے۔ جو کچھ بھی ہے خط کا جواب لکھ دیجیئے اور میری پریشانی دور کیجیئے۔ ورنہ میں یہی سمجھوں گا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ آپ مجھے خط لکھیں۔ آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔

تمہارا دوست
ا۔ ب۔ ج۔ د

Scanned with CamScanner

خاکہ

خاکہ نثری ادب کی ایک دلکش صنف ہے۔ خاکہ انگریزی لفظ (Sketch) کا ترجمہ ہے۔ خاکے کو مرقع یا قلمی تصویر بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن عام اصطلاح میں اس کو خاکہ ہی کہتے ہیں۔ اس کا فن غزل اور افسانے کے فن سے بہت مشابہت رکھتا ہے کیونکہ اختصار اس کا بنیادی شرط ہے۔ چند یہ خاکہ نگاری افسانے سے بہت قریب ہے اس لئے خاکہ کو موجودہ دور میں اردو ادب کی مقبول ترین صنف ہے۔ خاکہ نہ سیرت نگاری ہے نہ سوانح عمری۔ یہ کسی دل آویز شخصیت کی دھندلی تصویر ہے۔ خاکہ سے مراد ایک ایسی نثری تحریر جس میں کسی شخصیت کی منفرد اور نمایاں خصوصیات کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی مکمل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ اس میں جس شخص کی تصویر کشی کی جاتی ہے اس کے خیالات و افکار، سیرت و کردار، عادات و اطوار سب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ کامیاب خاکہ نگار وہی ہے جو بغیر کسی لحاظ و تکلف کے اصل اور حقیقی باتیں سامنے لائے۔ خاکہ نگار جس طرح کسی شخص کو سمجھتا اور جانتا ہو، ایسے اسی طرح اس کا صحیح اور درست نقشہ کھینچنا چاہئے۔ خاکہ نگار اس شخصیت سے نہ صرف متاثر ہو بلکہ اس انسان کی شخصیت سے مکمل واقفیت اور قربت بھی رکھتا ہو تب اس کا خاکہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ پہلی ملاقات یا چند ملاقاتوں کے تاثرات کی بنیاد پر کسی کا خاکہ لکھ دینے سے خاکہ نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ خاکہ نگار کی تحریر سے مرعوبیت کا اظہار نہیں ہونا چاہئے۔ اس کا بیان غیر جانبدارانہ ہونا چاہئے۔ جس طرح خوبیوں کا بیان مرعوبیت سے پاک ہونا چاہئے اسی طرح خامیوں کے بیان میں تحقیر و اہانت یا ذاتی دشمنی و عناد کا پہلو نہیں آنا چاہئے۔ خامیوں کے بیان سے بھی اپنائیت کا احساس نمایاں ہونا چاہئے۔ اچھے خاکہ میں ان خصوصیات کا بیان بے تکلفی، برجستگی اور لطیف مزاح کی چاشنی کے ساتھ ہوتا ہے۔

مولوی عبدالحق نے "نام دیو مالی" اور رشید احمد صدیقی نے "کندن" کا خاکہ لکھ کر یہ واضح کیا کہ خاکے کے موضوع عظیم شخصیتیں ہی نہیں، معمولی انسان بھی ہو سکتے ہیں۔ اچھا برا، چھوٹا بڑا، امیر غریب، ہر طرح کے انسان کا خاکہ لکھا جا سکتا ہے بشرطیکہ خاکہ نگار نے اسے ہر رنگ اور ہر روپ میں نزدیک سے دیکھا ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ خاکہ نگار کا قلم مردہ جسم میں جان ڈال دینے کے ہنر سے واقف ہو۔

عبدالحلیم شرر، مولوی نذیر احمد، مرزا ہادی رسوا اور خواجہ حسن نظامی کی تحریروں سے بھی خاکوں کے نمونے نظر آتے ہیں۔ لیکن اردو خاکہ نگاری کا باقاعدہ آغاز مرزا فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۳ء - ۱۹۴۷ء) سے ہوا۔ انھوں نے نذیر احمد کا خاکہ لکھ کر اردو میں خاکہ نگاری کی بنیاد ڈالی۔ اس کے علاوہ انھوں نے کئی اور خاکے بھی لکھے۔

NOTES

عصمت چغتائی اور منٹو نے بھی بہت اچھے خاکے لکھے۔ اعجاز حسین، شوکت تھانوی، شاہد احمد دہلوی بھی اہم خاکہ نگار رہیں۔ محمد طفیل اور مشتاق احمد یوسفی کے لکھے ہوئے خاکے بہت جاذب نظر ہیں نثری اصناف میں خاکہ نگاری بہت مقبول رہا۔ یقین ہے کہ یہ صنف برابر ترقی کرتی رہے گی۔

Scanned with CamScanner

مرزا فرحت اللہ بیگ

حالاتِ زندگی :-

مرزا فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۳ء میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی کے گورنمنٹ اسکول سے حاصل کی اور اسٹیفن کالج سے بی۔اے کی سند حاصل کی۔ آپ کے بزرگ بدخشاں کے رہنے والے تھے وہاں سے ہجرت کر کے دہلی آ گئے۔ ۱۹۰۷ء میں مرزا فرحت اللہ بیگ حیدرآباد آ گئے۔ پہلے محکمہ تعلیم میں کام کیا۔ ترقی کرتے کرتے اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدے تک پہنچے۔ بالآخر ۱۹۴۷ء میں حیدرآباد میں انتقال کیا۔

ادبی خدمات :-

مرزا فرحت اللہ بیگ اردو کے صف اوّل کے ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ آپ مزاح نگاری کے اعتبار سے ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ 1919ء میں انہوں نے پہلا مضمون رسالہ "افادہ" آگرہ میں لکھا۔ ان کے مضامین سات جلدوں میں "مضامین فرحت" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ نظموں کا مجموعہ "میری شاعری" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ اس میں بھی مزاحیہ رنگ نمایاں ہے۔ آپ کا اندازِ بیان بے حد شگفتہ اور رواں ہے۔ آپ نے ہر طبقے کے محاورات بڑی خوبی کے ساتھ استعمال کئے ہیں۔ آپ اکثر ایسے محاورات اور الفاظ اپنی تحریر میں لاتے تھے جو دلی کے لوگ گفتگو میں استعمال کرتے تھے۔

سوالات :- "نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی"

سوال 1:- نذیر احمد کی شخصیت کے دلچسپ پہلوؤں کو اپنے الفاظ میں لکھیئے؟

جواب :- نذیر احمد کی شخصیت کے کچھ دلچسپ پہلو یہ ہیں۔ مولوی نذیر احمد ایک صاف گو انسان تھے۔ ان کا قد ٹھگنا تھا۔ جسم چست، پیٹ ذرا باہر اور سر پر معمولی سے بال تھے۔ ان کی آواز اونچی اور آنکھیں چھوٹی تھی۔ وہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو خود ہی بیان کرتے تھے۔ اپنی غربت اور لاچاری کا بیان بھی وضاحت سے کرتے تھے۔ وہ سچ بولنے میں جھجھک محسوس نہیں کرتے تھے۔

سوال 2:- نذیر احمد نے اپنے بچپن کے کن واقعات کو لطف لے کر بیان کیا ہے؟ بتایئے؟

جواب :- نذیر احمد نے اپنے بچپن کے مختلف واقعات کو لطف لے لے کر بیان کیا ہے۔ جیسے اپنی غربت اور لاچاری کے وجہ سے لوگوں کے گھروں میں کھانا کھانے کے لئے جانا، تعلیم کا شوق کافی حد تک تھا، اور اپنی قابلیت کی وجہ سے دہلی کالج

Scanned with CamScanner

میں داخلہ مل جانا نہایت ہی موثر انداز میں بیان کیا ہے۔
سوال 3:۔ نذیر احمد کے ساتھ پڑھنے والوں میں کون کون سے ادیب شامل تھے؟
جواب:۔ نذیر احمد کے ساتھ پڑھنے والوں میں سر سید احمد خان، منشی ذکا اللہ اور پیارے لال وغیرہ شامل تھے۔
سوال 4:۔ نذیر احمد نے آج کل کی تعلیم کی کون کون سی خامیاں بتائی ہیں؟
جواب:۔ نذیر احمد کا آج کل کی تعلیم کے متعلق یہ نظریہ ہے کہ آج کل کے استاد پڑھاتے نہیں بلکہ طلبا پر علم لادتے ہیں اور ایک ہی کلاس میں مختلف مضامین پڑھائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے طلبا سب مضامین پر عبور حاصل نہیں کر سکتے اور وہ کامل بھی نہیں بن پاتے ہیں جیسے پرانے زمانے میں ایک مضمون پڑھا کر طلبا کو کامل بناتے تھے۔
سوال 5:۔ اس سبق میں جہاں مزاحیہ انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس کی نشاندہی کیجئے؟
جواب:۔ اس سبق میں مولوی صاحب کا حلیہ اور عبدالحامد کے گھر جا کر ان کی بیٹی سے مصالحہ پسوانے کے واقعات کو مزاحیہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔
سوال 6:۔ اس سبق میں جو محاورے استعمال ہوئے ہیں۔ انہیں تلاش کر کے لکھئے؟
جواب:۔ اس سبق میں جو محاورات استعمال ہوئے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:۔
روٹیاں سمیٹنا، آنکھوں کے سامنے آجانا، راستہ صاف کرنا، باتیں بنانا، گھاس کاٹنا، کاٹھ کے الو، آج پڑھا کل بھولے، کالنقش فی الحجر، کوچ کرنا اور اللہ بس باقی ہوس وغیرہ۔

خلاصہ:۔ "نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی"

مرزا فرحت اللہ بیگ اس خاکے میں اپنے اُستاد مولوی نذیر احمد کا نقشہ اس ہنر مندی سے کھینچتے ہیں کہ مولوی صاحب اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہماری نظروں کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے حلیے کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان کا رنگ سانولا اور قد چھوٹا، قدرے موٹے بھی تھے، پیٹ ذرا باہر، سر پر معمولی بال، آنکھیں چھوٹی، آواز اونچی، انداز مزاحیہ تھا۔ اپنی خوبیاں اور خامیاں خود ہی بیان کرتے ہیں۔ نذیر احمد نے اپنے بچپن کی غربت، تعلیم کا شوق، گھر گھر جا کر روٹیاں مانگ کر لانا اور اپنی ذہانت اور قابلیت کی وجہ سے دہلی کالج میں داخلہ مل جانے کے واقعات کو لطف لے کر بیان کیا ہے۔ عبدالحامد کی لڑکی کے ہاتھوں مصالحہ پسوانے کے واقعہ کو مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد جدید تعلیم

Scanned with CamScanner

کا اپنے زمانے سے موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہم بگلن کے ساتھ پڑھتے تھے اور آج کے طالب علموں کی طرح نہیں پڑھتے جو بتا سکیے۔ بہت ساری کتابیں ایک ساتھ پڑھتے ہیں کیونکہ ایک مضمون کو پوری طرح مکمل کرنا، پڑھایا تھا۔ آج کل کی تعلیم عجیب ہے ایک ساتھ بہت سارا علم ٹھونسا جاتا ہے۔ جس کو انسان بہت جلد بھول بھی جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کلامِ مجید کا ترجمہ کرنے پر اپنی لیاقت کی تعریف کرتے ہیں۔ اردو ادب کی مشہور تصانیف اسکو معمولی لگتی تھی۔ مولوی صاحب مرزا فرحت اللہ بیگ کے سامنے اپنی ذہانت کا اعتراف کرتے ہیں۔ کہ کلامِ مجید کا ترجمہ کرتے میں انہیں کافی محنت کرنا پڑتی تھی۔ آخر میں مرزا فرحت اللہ بیگ مولوی صاحب سے کہتا ہیں اینٹھنے کا ذکر کرنے کے بعد اس کے دنیا سے کوچ کرنے پر نہایت افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ دنیا فانی ہے۔ یہاں لوگ آتے ہیں اور چند دن رہ کر چلے جاتے ہیں۔ سب فانی ہے صرف خدا ہی باقی رہنے والا ہے۔

"حصۂ شاعری"

"فراق گورکھپوری"

حالاتِ زندگی:-

آپ کا پورا اصلی نام رگھوپتی سہائے تھا اور فراق تخلص۔ ۱۸۹۶ء میں گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام منشی گورکھ پرشاد عبرت تھا۔ وہ اردو اور فارسی میں شاعری کرتے تھے۔ فراق کے گھر کا ماحول شاعرانہ تھا۔ چنانچہ بچپن ہی سے شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا۔ آپ تیرہ برس کی عمر سے شعر کہنے لگے تھے۔ تعلیم الہ آباد میں حاصل کی۔ اردو اور فارسی کے علاوہ انگریزی میں کافی مہارت تھی۔ فراق نے الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا اور وہی مستقل قیام کیا۔ آپ نے اردو زبان کی بھی کافی خدمت کی۔ ۱۹۵۹ء میں آپ نوکری سے ریٹائر ہوگئے۔ ۳ مارچ ۱۹۸۲ء میں اس دنیا کو خیرآباد کیا۔

شاعرانہ خصوصیات:-

فراق گورکھپوری بنیادی طور پر غزل گو شاعر تھے۔ غزلوں کے ساتھ ساتھ آپ نے نظمیں بھی لکھی۔ آپ کی شاعری میں تغزل کی ایسی لطافت اور دلکشی پائی جاتی ہے جو اُس عہد کے دوسرے شعرا کے یہاں نہیں ملتی۔ آپ نے میر تقی میر (خدائے سخن) کی شعری روایت کی بازیافت کی اور صدیوں کی تہذیبی روح کو آج کے انسان کی دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ کر دیا۔ آپ کی شاعری کے بنیادی موضوعات حسن و عشق، انسانی تعلقات کی دھوپ چھاؤں، فطرت و جمالیات ہیں۔ آپ کے کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے جن میں روحِ کائنات، رمز و کنایات، غزلستان، شبنمستان، اور گلِ نغمہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ کی رباعیوں کا مجموعہ "روپ" بھی بہت مشہور ہے۔ آپ کو ۱۹۶۰ء میں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ اور ۱۹۶۸ء میں پدم بھوشن کا خطاب ملا۔ فراق گورکھپوری اردو شاعری میں اپنے لب و لہجہ سے الگ پہچانے جاتے ہیں۔

NOTES

Scanned with CamScanner

غزل ۱

ع۱۔ رکی رکی سی شبِ مرگ ختم پر آئی — وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ موت کی رات آہستہ آہستہ ختم ہونے لگی ہے اور نئی زندگی کی روشنی نمودار ہونے لگی ہے۔ یعنی ظلم و جبر اور تشدد کی راتیں ختم ہونے پر آئی ہیں اور نئی صبح خوشیوں بھری زندگی کی خوش خبری لائی ہے۔ گویا شاعر سامراجی حکومت کے ظلم کے خاتمہ ہونے کی نشاندہی ایک منفرد انداز میں کرتے ہیں۔

ع۲۔ یہ موڑ وہ ہے کہ پرچھائیاں نہ دے گی ساتھ — مسافروں سے کہو اُس کی رہ گزر آئی

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ محبت کے راستے میں ایک ایسا مقام اور موڑ بھی آتا ہے جہاں عاشقوں کے سائے بھی اُن کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ شاعر محبت کے ایک ایسے مقام کی نشاندہی کرتا ہے جو بہت مشکل اور کٹھن مقام ہے۔ شاعر آزادئ وطن کے چاہنے والوں کو اس بات سے باخبر کرتا ہے کہ یہ ایسا موڑ ہے جہاں انسان کو بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ گویا شاعر اپنے ہم وطنوں کو ہمت اور جرأت سے کام لینے کو کہتا ہے۔

ع۳۔ فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن — پہنچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھیں بھر آئی

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ محبوب کی منزل کی جانب جانے والے ہر راستے کا ماحول خوشنما اور دلکش تھا۔ لیکن جب ہم نے محبوب کی منزل پائی تو دُکھ کی وجہ سے ہماری آنکھیں پرنم ہوئی۔ کیونکہ جو امیدیں ہم نے رکھی تھی ویسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ شاعر سامراجی نظام کے ظلم سے نکل کر جس آزادی کا مشتاق تھا ویسا اُس نے نہیں پایا اس لئے شاعر بہت اُداس ہے۔

ع۴۔ کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی — اُمیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ محبوب کی منزل یعنی وطن کی آزادی کا ماحول دلکش اور زندگی بخش ہوتا ہے لیکن وطن کے چاہنے والوں اور آزادی حاصل کرنے والے امیدواروں میں کچھ لوگ منزلِ مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی اپنی زندگی موت کے حوالے کرتے ہیں۔ گویا آزادی حاصل کرنے کے لئے بہت ساری قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔

ع۵۔ کہاں ہر ایک سے انسانیت کا بار اُٹھا — کہ یہ بلا بھی تیرے عاشقوں کے سر آئی

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ انسانیت کا بوجھ اُٹھانا ہر انسان کے بس میں نہیں ہوتا ہے۔ ہر کوئی انسانیت کا علمبردار نہیں ہو سکتا۔ شاعر انسانیت کے بوجھ کو ایک مصیبت سے تشبیہہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس ~~بھلا~~ بلا یعنی انسانیت کا بوجھ وہی اٹھاتے ہیں جو محبوبِ حقیقی کے سچے عاشق ہوتے ہیں۔

M	T	W	T	F	S	S
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30	31	

May 2014

M	T	W	T	F	S	S
30						1
2	3	4	5	6	7	8
9	10	11	12	13	14	15
16	17	18	19	20	21	22
23	24	25	26	27	28	29

June 2014

غزل ۲

۱- سر میں سودا بھی نہیں دل میں تمنا بھی نہیں — لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسہ بھی نہیں

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ بظاہر مجھے عشق کی کوئی چاہت نہیں ہے۔ میرے دل و دماغ میں اس عشق کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ لیکن یہ بھروسہ نہیں کہ کب یہ دل پھر سے عشق کی طرف راغب ہو جائے گا۔ یعنی محبت کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ اس کو ہمیشہ کے لئے ترک کرنا ناممکن ہے۔

۲- دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں — لیکن اس جلوہ گہہ ناز سے اٹھتا بھی نہیں

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میرا محبوب نہ مجھے اپنوں میں شمار کرتا ہے نہ ہی غیروں میں شمار کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی میرا یہ بے چین دل محبوب کی جلوہ گاہ سے اٹھتا ہی نہیں ہے۔ گویا میرے دل میں یہ امید ہے کہ میرا محبوب ایک نہ ایک دن لوٹ آئے گا۔

۳- مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست — آہ! اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ مہربانی اور محبت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دونوں جذبوں کو ہم ایک ہی نام نہیں دے سکتے۔ پہلے تم مجھ سے بے وجہ ناراض ہوا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ تعلق بھی آہستہ آہستہ ختم ہوا ہے۔ اب تم مجھ سے ناراض بھی نہیں رہتے ہو۔

۴- ایک مدت سے تیری یاد بھی نہ آئی ہمیں — اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ بہت وقت بیت چکا ہے اور مجھے تیری یاد نہیں آئی۔ لیکن آپ ایسا گمان مت کرنا کہ ہم نے تجھے بھلا دیا۔ تمہیں بھول جانا میرے لئے ناممکن ہے۔

۵- آہ! یہ مجمعِ احباب یہ بزمِ خاموش — آج محفل میں فراق سخن آرا بھی نہیں

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں افسوس اور حیرت کے انداز میں ہوتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دوستوں کی محفل خوب سجی ہوئی ہے لیکن اس پر خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ محفل میں آج فراق موجود نہیں ہے۔ اگر اس محفل میں فراق جلوہ نما ہوتے تو وہ محفل کو اپنے کلام سے نوازتا تو اس قدر محفل خاموش نہیں ہوتی یعنی فراق کے بغیر بے نور اور بے رونق ہے۔

22 Sunday

NOTES

Scanned with CamScanner

غزل ۳

۱- آنکھوں میں جو بات ہو گئی ہے — اِک شرحِ حیات ہو گئی ہے

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میری آنکھیں جب میرے محبوب سے ملیں تو اشاروں میں ہی دل کی بات ہو گئی اور عشق نے پوری زندگی کو اپنا لیا۔ میری زندگی کی تشریح اس طرح ہو گئی کہ مجھے اب پوری زندگی اسی عشق میں بتانی ہوگی اور اپنے محبوب کے وصل کا انتظار زندگی بھر کرنا ہوگا۔

۲- کیا جانیے موت کیا تھی پہلے — اب میری حیات ہو گئی ہے

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ پہلے مجھے موت سے بے خبر تھا۔ لیکن جب زندگی کی تلخیوں اور مشکلوں نے مجھے اپنا دہشت ناک چہرہ دکھایا تو میری زندگی موت کی طرح دردناک اور خوفزدہ ہو گئی۔ یعنی میں زندگی کے بجائے موت کو اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں۔ گویا شاعر نے زندگی کو موت پر ترجیح دی ہے۔

۳- اس دور میں زندگی بشر کی — بیمار کی رات ہو گئی ہے

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ موجودہ دور کے انسان کی زندگی ایک بیمار کی رات کی طرح اذیت ناک اور تکلیف دہ ہو گئی ہے۔ جس طرح ایک بیمار رات کو درد کی وجہ سے تکلیف اور پریشانی کی شدت محسوس کرتا ہے اسی طرح آج کے زمانے میں ایک انسان کی زندگی تکلیف دہ بن چکی ہے۔ گویا شاعر نے دورِ حاضر کے انسان کی زندگی کو بیمار کی رات کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

۴- جس چیز کو چھو دیا ہے تو نے — اِک برگِ نبات ہو گئی ہے

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ جس چیز کو تم نے چھوا ہے وہ تازہ ہوا اور سرسبز ہو گئی۔ تیرے چھونے سے ہر چیز میں تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ گویا شاعر اپنے محبوب کی تعریف ایک منفرد انداز میں کرتے ہوئے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہر چیز میں تازگی میرے محبوب کے چھونے سے ہیں۔

۵- اک ایک صفت فراق اس کی — دیکھا ہے تو ذات ہو گئی ہے

یہ شعر فراق گورکھپوری کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ میں اپنے محبوب سے اس قدر شدت سے محبت کرتا ہوں کہ اس کی ہر خوبی اور اچھائی مجھے اپنی ذات یعنی زندگی محسوس ہوتی ہے۔ گویا شاعر نے اپنے محبوب کو اپنی رگ رگ میں بسایا ہے۔ جسکو بھلانا شاعر کے لئے ناممکن ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

میرغلام رسول نازکی

حالاتِ زندگی:-

میر غلام رسول نازکی ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام میر غلام مصطفیٰ نازکی تھا۔ ۱۹۱۱ء میں انہوں نے سرینگر سے بانڈی پورہ کی طرف ہجرت کی۔ غلام رسول نازکی کا بچپن یہیں گزرا۔ آپ کے والد عربی اور فارسی کے بڑے عالم تھے آپ نے فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ چھٹی جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد سرینگر آئے اور اسلامیہ اسکول سرینگر سے پہلے مڈل کا اور اس کے بعد پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔ والد کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد ہندوارہ میں عربی اور فارسی کے استاد کی حیثیت سے ملازمت کی۔ ملازمت کے دوران ہی آپ نے منشی عالم، میٹرک، منشی فاضل، ادیب فاضل اور ایف اے کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۴۳ء میں ماہر تعلیم اور اُس وقت کے ناظم تعلیمات خواجہ غلام السیدین کے ساتھ لٹریری اسسٹنٹ کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۴۸ء میں آپ ریڈیو کشمیر جموں سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد آپ کا تبادلہ ریڈیو کشمیر سرینگر میں ہوا اور یہیں سے سبکدوش ہوئے۔ بالآخر ۱۹۹۸ء میں آپ نے انتقال کیا۔

شاعرانہ خصوصیات:-

میر غلام رسول نازکی صاحب کی طبیعت شروع سے ہی شعر و سخن کی طرف مائل تھی۔ گھر میں بھی علمی و ادبی ماحول میسر تھا۔ آپ کے والد عالم ہونے کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری کے بھی دلدادہ تھے۔ انہوں نے ہی نازکی صاحب کو ادب کی نزاکتوں سے روشناس کرایا۔ غزل کے علاوہ نازکی صاحب نے نظم، قطعہ اور رباعی میں بھی اپنا زورِ قلم آزمایا۔ وہ نعت بھی خوب لکھتے تھے۔ کشمیری میں بھی وہ شعر کہتے تھے۔ اردو میں "دیدۂ تر" "چراغِ راہ" اور "متاعِ فقیر"، اور کشمیری میں "نمرود نامہ" "آوازِ دوست" اور "کاویہ ودل" نام کے شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

نازکی صاحب کی شاعری میں عام طور پر حسن و عشق، غمِ روزگار، دنیا کی بے ثباتی، قدروں کی پامالی اور درد و حسرت کے موضوعات ملتے ہیں۔ ان کی شاعری کا بنیادی اور اہم ترین موضوع غم ہے۔ وہ غم کو زندگی کی اہم ترین حقیقت مانتے ہیں یہاں تک کہ غم ہی کو بندہ اور مولا کے درمیان رشتے کی وجہ قرار دیتے ہیں۔

میر غلام رسول نازکی

غزل ۱

Wednesday 18 JUN 2014

۱۔ محبوب کے ہونٹوں پر سیلاب تبسم ہے — یا نور کے دریا کی موجوں میں تلاطم ہے

یہ شعر میر غلام رسول نازکی کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب کی مسکراہٹ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب میرا محبوب میرے سامنے کسی وجہ سے مسکراتا ہے تو اس کے مسکرانے سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نور کے دریا میں لہروں کی ہلچل ہے۔

۲۔ اب خوب گزرتی ہے انجام خدا جانے — ہر سانس میں نغمہ ہے ہر لے میں ترنم

یہ شعر نازکی صاحب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ ابھی میری زندگی اچھی طرح گزر بسر ہو رہی ہے۔ لیکن آگے اس کا انجام کیا ہوگا یہ تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس وقت زندگی کی ہر سانس میں گیت رواں ہے اور ہر انداز پُرمسرت ہے۔ یعنی زندگی بڑے مزے سے گزر رہی ہے۔ آئندہ اس پر کیا گزرے گی یہ صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔

۳۔ دل ڈٹ کے مقابل ہے آلام و مصائب سے — گویا کہ چٹانوں سے لہروں کا تصادم ہے

یہ شعر نازکی صاحب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے دل کی ہمت اور جرأت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرا دل ہر غم اور مصیبت کا اس طرح ڈٹ کے مقابلہ کرتا ہے جس طرح سمندر کی لہریں چٹانوں سے ٹکراتی ہے لیکن چٹان کا کچھ بگڑ نہیں سکتا بلکہ وہ لہریں خود ہی پاش پاش ہوتی ہے ہوئی واپس سمندر میں گرتی ہے۔ گویا شاعر اپنے دل کی بہادری کا ذکر کے منفرد انداز میں کرتے ہے۔

۴۔ دنیائے محبت کی ہر چیز نرالی ہے — خاموش اشاروں پر بنیادِ تکلم ہے

یہ شعر نازکی صاحب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ محبت کی دنیا میں ہر چیز بے مثال ہوتی ہے ہر چیز انوکھی ہوتی ہے۔ سب سے عجیب اور انوکھی عاشق اور معشوق کی وہ باتیں ہوتی ہے جو ان کے درمیان اشاروں میں ہوتی ہے جنہیں کوئی دوسرا سمجھ نہیں سکتا ہے۔

۵۔ جب جنتِ ارضی میں آرام نہیں ملتا — پھر خلدِ بریں کیا ہے واعظ کا توہم ہے

یہ شعر نازکی صاحب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ جب زمین پر پائی جانے والی جنت یعنی وادیٔ کشمیر میں ایک انسان کو سکھ اور آرام میسر نہیں تو پھر خلدِ بریں یعنی حقیقی جنت میں کون سا آرام ملے گا۔ یہ تو محض ایک واعظ کا وہم اور خیال ہے۔ اس قسم کے اشعار میں معنوی خوبی کی چاہے کتنی بھی وکالت کی جائے اگر سنجیدگی سے غور و فکر کی جائے تو شعرا کو اس قسم کے اشعار لکھنے سے پرہیز ہی کرنا چاہئے۔

— ✓ —

Scanned with CamScanner

M	T	W	T	F	S	S
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30	31	

May 2014

M	T	W	T	F	S	S
30						1
2	3	4	5	6	7	8
9	10	11	12	13	14	15
16	17	18	19	20	21	22
23	24	25	26	27	28	29

June 2014

میر غلام رسول نازکی

غزل ۲

۱۔ اس شوخ کو کیا دیکھا آنکھوں میں سمٹ آئی — شیراز کی شادابی کشمیر کی رعنائی

یہ شعر میر غلام رسول نازکی صاحب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب کی خوبصورتی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب اس نے اپنے محبوب کے حسین و جمیل چہرے کو دیکھا تو ایسا لگ رہا تھا کہ شیراز یعنی ایران کے سرسبز شاداب شہر کا ہرا بھرا حسن اور کشمیر کی ساری خوبصورتی بہ یک وقت اس کے محبوب میں موجود ہے۔

۲۔ رہ رہ کے میرے دل میں اک درد سا اٹھتا ہے — آ اپنے لبوں سے دے پیغامِ مسیحائی

یہ شعر نازکی صاحب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے میرے محبوب جب سے میں نے اپنے دل میں تیری محبت کو جگہ دی تب سے میں بے قرار اور بے سکون ہوا ہوں۔ میرا تیرے بغیر جینا نہیں جاتا۔ میرے دل میں اس عشق کی وجہ سے درد دن بہ دن بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اس کا علاج صرف تمہارے پاس ہے۔ تم میرے لئے مسیحا بن کر لوٹ آؤ اور مجھے زندگی کا پیغام دے جاؤ

۳۔ ہر شے کی حضوری میں جھکوا دیا سر میرا — اے ذوقِ جبین سائی اے لذتِ رسوائی

یہ شعر نازکی صاحب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ جب میں محبوب کی گلی سے نامراد اور ناکام ہو کے لوٹا تو مجھے رسوائی کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے مجھے ہر چیز کے سامنے اپنا سر جھکانا پڑا جس سے مجھے لذت محسوس ہو رہی ہے۔

۴۔ شرمندۂ الفت ہوں رسوائے محبت ہوں — دامن میں چھپا مجھ کو اے گوشۂ تنہائی

یہ شعر نازکی صاحب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میں محبوب کے عشق میں رسوا ہوا ہوں میں اپنی محبت پہ شرمندہ ہوں کہ مجھے محبت نبھانی آئی نہیں۔ لہٰذا اب شاعر تنہائی کو پکارتا ہے کہ اے تنہائی اب تو ہی مجھے اپنا لے کیونکہ میں بہت پریشان ہوں۔ گویا شاعر اب تنہا رہنا ہی پسند کرتا ہے۔

۵۔ سوکھا ہوا سبزہ ہوں گلزارِ محبت کا — کب سایہ فگن ہوگا وہ سروِ دلآرائی

یہ شعر نازکی صاحب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میں محبت کے باغ میں ایک سوکھے ہوئے گھاس کے ٹکڑے کی مانند ہوں۔ جس کی زندگی محبوب کی چھاؤں میں ہی منحصر ہے جو ایک اونچے سرو کی مانند ہے۔ گویا شاعر محبوب کی جدائی برداشت نہیں کر پاتا ہے اور اب اسے اپنے محبوب سے ملاقات کی تڑپ حد سے زیادہ ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

فیض احمد فیض

حالاتِ زندگی:-

فیض احمد فیض ۱۹۱۱ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام چودھری محمد سلطان خان تھا۔ وہ عربی، فارسی اور انگریزی میں کمال کی مہارت رکھتے تھے۔ فیض نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ سے حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم آپ نے لاہور سے حاصل کی۔ انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد انگریزی لیکچرر کی حیثیت سے ملازمت کی ابتدا کی۔ تقسیم ملک سے چھ مہینے پہلے فیض کو "پاکستان ٹائمز" کا ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ چار برس آپ نے جیل میں گزارے۔ فیض احمد فیض سادہ لوح انسان کی شخصیت کے مالک تھے۔ ۱۹۸۴ء کو لاہور میں انتقال فرمایا۔

شاعرانہ خصوصیات:-

فیض احمد فیض کی ابتدائی شاعری تنہائی اور انتظار کی کیفیتوں کے گرد گھومتی ہے۔ فیض کم سے کم الفاظ میں تہہ در تہہ معنوں کے زیادہ سے زیادہ دفتر کھول دیتے ہیں۔ وہ غصہ بہت کم کرتے تھے۔ مزاج کی نرمی ان کے کلام میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ مظلوموں، مزدوروں اور زیردستوں سے ہمدردی فیض کے خمیر میں شامل تھی۔ فیض احمد فیض کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے غزل کی کلاسیکی روایات سے پوری طرح استفادہ کیا۔ اپنی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت سے انقلابی فکر اور عاشقانہ لہجے کو ایسا آمیز کیا کہ اردو شاعری میں ایک نئی جمالیاتی شان پیدا ہوگئی اور ایک نئے طرزِ بیان کی بنیاد پڑی۔ فیض ایک دردمند دل رکھتے تھے۔ انہوں نے زندگی میں بڑی سے بڑی سختیاں جھیلیں لیکن ظلم اور بے انصافی کے ساتھ کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔

فیض کا پہلا شعری مجموعہ "نقشِ فریادی" کے نام سے ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا۔ ان کے کل سات مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ زنداں نامہ، دستِ تہِ سنگ، سرِ وادیٔ سینا، شامِ شہرِ یاراں اور مرے دل مرے مسافر اہمیت کے حامل ہیں۔ "دستِ صبا" کی اشاعت سے ان کی شہرت بامِ عروج پر پہنچ گئی۔ ان کا کلیات ہندوستان میں "حرف حرف" کے نام سے، لندن میں "سارے سخن ہمارے" کے نام سے اور لاہور میں "نسخہ ہائے وفا" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

Scanned with CamScanner

May 2014

M	T	W	T	F	S	S
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30	31	

June 2014

M	T	W	T	F	S	S
30						
						1
2	3	4	5	6	7	8
9	10	11	12	13	14	15
16	17	18	19	20	21	22
23	24	25	26	27	28	29

فیض احمد فیض

غزل ۱

۱۔ گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

یہ شعر فراق فیض کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ ملاقات کا موسم آیا ہے۔ نئے بہار کی صبح پھولوں میں رنگ بکھر رہی ہے۔ تمہارے یہاں نہ ہونے سے باغ کی زینت بکھری ہوئی ہے یعنی تمہارے بغیر گلشن بے رونق ہے۔ اس لئے تمہارا یہاں آنا ضروری ہے تاکہ گلشن بہار کا لطف اٹھا سکے۔

۲۔ قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

یہ شعر فیض کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے دوستوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ آج قید خانے میں اداسی چھائی ہوئی ہے اس لئے اے میرے دوستو محبوب کے در سے آنے والی صبح کی ہوا سے کہو کہ میرے محبوب کا ذکر کرے جس سے میری اداسی دور ہو سکتی ہے۔ شاعر کا محبوب وطن بھی ہو سکتا ہے جس کی یاد اسے قیدخانے میں بار بار ستاتی ہے۔

۳۔ کبھی تو صبح تیرے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

یہ شعر فیض کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں دن رات سے متعلق اپنے خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کبھی کاش کبھی ایسا ہوتا کہ ہماری ہر صبح کا آغاز محبوب کے مسکرانے سے ہوتا یعنی جب صبح کو میری آنکھیں کھلتی تو محبوب کا دیدار ہوتا اور شام کو محبوب کی پہلو میں رہ کر اس کی زلفوں کی خوشبو میرے دل کو مہکا دے۔ گویا شاعر اپنے صبح و شام امن و امان سے گزارنا چاہتا ہے۔

۴۔ بڑا ہے درد کا رشتہ یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

یہ شعر فیض کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میرے اور میرے محبوب کے درمیان جو دردِ محبت کا رشتہ ہے یہ کوئی معمولی رشتہ نہیں ہے۔ محبوب کے ایک اشارے پر اس کا نام سنتے ہی اس کے ہزاروں چاہنے والے آئیں گے۔ گویا شاعر کو اپنے محبوب وطن سے ایسا گہرا رشتہ ہے جس کی یاد اس کو ہر پل ستاتی رہتی ہے۔

۵۔ جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تیری عاقبت سنوار چلے

یہ شعر فیض کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ جدائی کی رات میں ہم پر کیا گزرا وہ درد ہم ہی جانتے ہیں۔ جیسے تیسے وہ رات بیت گئی۔ مگر ہم نے تیری جدائی میں جو آنسوؤں بہائے ہیں ان کی وجہ سے تمہاری آخرت سنور گئی۔ گویا شاعر اپنے محبوب کی اچھائی کی تصدیق کرتا ہے۔ ان کے نیک ہونے کی علامت شاعر کے آنسوؤں ہے۔

۶۔ حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

یہ شعر فیض کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ محبوب کی طرف سے یہ پیغام پہنچا ہے کہ اپنی دیوانگی کا ثبوت دیا جائے۔ ہمارے پاس ثبوت کے لئے چاک کیا ہوا گریبان تھا۔ ہم اسی پھٹے پرانے گریبان کے ٹکڑے لے کر محبوب کے پاس پہنچے تاکہ ہماری دیوانگی ثابت ہو جائے۔

۷۔ مقام، فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

یہ شعر فیض کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ زندگی کے اس کٹھن سفر میں ہمیں کبھی بھی سکون اور آرام کا کوئی مقام نہیں ملا۔ جب بھی ہم محبوب کی گلیوں سے ناکام ہو کے نکلے تو سکون نہ ملنے کی وجہ سے ہمیں سولی کی جانب چلنا پڑا۔ گویا اطمینان کی سانس لینا ہمارے نصیب

Scanned with CamScanner

فیض احمد فیض

میں نہیں ہوا۔

غزل ۲

۱۔ کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی — سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی

یہ شعر فیض کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے دل سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے دل تمہارا یہ درد میں مبتلا رہنا کب رُکے گا۔ یعنی میں کب اپنی راتیں سکون کے ساتھ گزاروں۔ شاعر محبوب کی جدائی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے دل سے کہتے ہیں کہ میرا محبوب یعنی آزادی کب آئے گی اور میری زندگی کی ایک خوبصورت صبح طلوع کب ہوگی۔ یعنی صحیح معنوں میں ظلم کا خاتمہ کب ہوگا۔

۲۔ کب جان لہو ہوگی کب اشک گہر ہوگا — کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہوگی

یہ شعر فیض کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنی روتی ہوئی آنکھ سے مخاطب فرماتے ہیں کہ تمہارے ان آنسوؤں کا اثر کب ہوگا۔ کب آپ کا رونا رنگ لائے گا اور کب میرے دل کی مرادیں پوری ہونگی۔ گویا شاعر اپنے ارمانوں اور تمناؤں کو پورا نہ ہونے کی وجہ سے آہ و زاری کرتا ہے۔

۳۔ کب مہکے گی فصل گل کب بہکے گا میخانہ — کب صبح سخن ہوگی کب شام نظر ہوگی

یہ شعر فیض کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ کب بہار کا موسم پھولوں کی خوشبو سے مہک اٹھے گا اور کب میخانے سے مے کشی بہک کر خوشیاں منائیں گے اور کب صبح کو کلام کرنے کی قوت حاصل ہوگی اور کب شام کو دیکھنے کی بصارت ملے گی۔ حقیقی معنوں میں کب خوشحالی آئے گی اور کب ہم اپنی زندگی سکھ کے ساتھ گزاریں گے۔

۴۔ واعظ ہے نہ زاہد ہے ناصح ہے نہ قاتل ہے — اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی

یہ شعر فیض کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ جب دنیا میں وعظ خواں، عبادت گزار، نصیحت کرنے والے اور قاتل یعنی محبوب ہی نہ رہے تو عاشقوں کی زندگی کس طرح بسر ہوگی۔ کیونکہ جب کوئی عاشق عشق میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کو اللہ کے نیک بندے نیکیوں کی تلقین کرتے ہیں یا اس کو نصیحت کرتے ہیں یا ان کے محبوب ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن جب یہ لوگ ہی نہیں رہے تو عاشق اور رند لوگوں کا جینا دشوار ہوگا۔

۵۔ کب تک ابھی رہ دیکھیں گے اے قامت جانانہ — کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہوگی

یہ شعر فیض کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ میں آپ کا اور کتنا انتظار کروں گا۔ میری آنکھیں تمہارے دیدار کے لئے ترستی ہے۔ تمہارے یہاں آنے سے اور تمہارے حسن و جمال اور لمبے قد کی وجہ سے جیسے قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا تم کو اس بات کی خبر ہوگی کہ قیامت کب آئے گی۔ یعنی شاعر کو کب اپنے محبوب کا وصال نصیب ہوگا۔

تنہا انصاری

حالاتِ زندگی :-

حسین علی انصاری نام اور تنہا تخلص۔ ۱۹۱۴ء میں دلنہ بارہمولہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حسن علی انصاری تھا۔ وہ ایک مشہور مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور اردو کے بہت بڑے عالم تھے۔ تنہا کی ابتدائی تعلیم دلنہ میں ہوئی۔ گھر کی مالی دشواریاں اس قدر تھی کہ انہیں مڈل پاس کرنے کے بعد ہی ملازمت کرنی پڑی۔ پہلے محکمہ امداد باہمی میں محرر کی حیثیت سے کام کیا اور بعد میں والد کی تقلید میں محکمہ تعلیم میں چلے آئے اور زندگی کے آخری دم تک مدرس کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ ملازمت کے دوران ہی اپنی مزید تعلیم کو جاری رکھا۔ جموں و کشمیر یونیورسٹی سے بی۔اے اور بی۔ایڈ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ سرینگر کے ٹیچرس ٹریننگ اسکول میں اردو زبان کے استاد کی حیثیت سے کام کیا۔ ان کی قابلیت اور اعلی کارکردگی کے باعث ۱۹۶۰ء میں حکومت ہند نے انہیں سال کے بہترین استاد ہونے کی بنا پر قومی ایوارڈ سے نوازا۔ ریٹائرمنٹ سے ۱۹ دن پہلے ۱۹۶۹ء میں آپ کا انتقال ہوا۔

شاعرانہ خصوصیات :-

تنہا انصاری کا شمار کشمیر کے صفِ اوّل کے شاعروں میں ہوتا ہے اردو کے علاوہ انہوں نے کشمیری میں بھی شعر کہے ہیں۔ وہ ایک اچھے نثرنگار کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔ ان کے خطوط کا مجموعہ "خاطرِ احباب" کے نام سے شائع ہوا۔ "تعلیمِ زبان" اور "کچھ اردو بولئے" ان کی دو اور کتابیں ہیں جو اردو کی درس و تدریس سے متعلق ہیں۔ ان کے شعری مجموعے اردو میں "شبنمستان" اور کشمیری میں "فرات" کے نام سے ان کی وفات کے بعد منظرِ عام پر آ گئے۔

تنہا انصاری کی ابتدائی ~~غزلیں~~ شاعری رومانیہ اور عشقیہ ہے جس میں روایتی طرزِ اظہار ملتا ہے۔ حسن و عشق کے موضوعات کے علاوہ ان کی شاعری میں، آزادی، محبت، سچائی، اور انسانی قدروں کی پامالی کا موضوع بہت ہی نمایاں ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں کشمیر کی خوبصورتی اور فطری حسن و جمال کی بہترین انداز میں تعریف کی ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

غزل ۱

۱ے۔ میری ہر صبح فرقت میں تیری — اندھیرا شامِ غم کا چھا رہا ہے

یہ شعر تنہا انصاری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ جب سے میں آپ سے جدا ہوا ہوں۔ تب سے میری زندگی سکون کے ساتھ نہیں گزرتی ہے۔ یعنی تیری جدائی سے مجھے اپنی ہر صبح غم کی وجہ سے اندھیری شام محسوس ہو رہی ہے۔ گویا شاعر کو اپنے محبوب کے بغیر نہ سکھ ہے نہ آرام بلکہ غم اور بے چینی محسوس ہوتی ہے۔

۲ے۔ کیئے جاتا ہوں جتنے میں جتنے مداوا — غمِ دل اور بڑھتا جا رہا ہے

یہ شعر تنہا انصاری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میرا دل محبوب کے غم میں نڈھال ہو چکا ہے۔ میں محبوب کے عشق میں اس قدر ڈوب چکا ہوں کہ جب میں اپنے دردِ دل کا علاج کرتا ہوں۔ میرے دل کا درد ہلکا ہونے کے باوجود بڑھتا ہی جاتا ہے۔ گویا شاعر کا دل محبوب کی جدائی میں تڑپ رہا ہے۔

۳ے۔ میری دنیا سے کٹ کر جانے والے — تصور تیرا کیوں تڑپا رہا ہے

یہ شعر تنہا انصاری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں جب سے تم نے مجھے اکیلا ہے چھوڑا ہے تب سے میری زندگی بے حال ہو گئی ہے۔ تمہاری یاد مجھے اس قدر ستاتی ہے کہ میں بڑی مشکل سے اپنے دل کو سنبھال لیتا ہوں اور میں تیرے خیالوں میں تڑپ رہا ہوں۔ گویا شاعر محبوب کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا ہے

۴ے۔ نقابِ رخ الٹ کر کس نے رکھ دی — فلک پر چاند بھی شرما رہا ہے

یہ شعر تنہا انصاری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب کی خوبصورتی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرا محبوب ہمیشہ اپنے چہرے کو چھپا کر رکھتا تھا۔ لیکن اس نے اچانک اس نے اپنے چہرے سے پردہ ہٹایا اور اس کے چہرے کی خوبصورتی اور حسن و جمال کو دیکھ کر آسمان پر چمکنے والا چاند بھی شرما گیا۔ گویا شاعر کا محبوب انتہائی خوبصورت ہے۔

۵ے۔ خیالِ پرسشِ اعمال تنہا — ابھی سے روح کو تڑپا رہا ہے

یہ شعر تنہا انصاری کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی میں کوئی نیک کام نہیں کیا جس سے مجھے آخرت میں نجات اور آزادی حاصل ہو سکتی۔ شاعر اپنے گناہوں پر نادم اور شرمندہ ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب اللہ عزوجل کے دربار میں اعمال کے بارے میں پوچھ گچھ ہوگی میں اللہ عزوجل کو کیا جواب دوں گا۔ یہی خیال مجھے خوفزدہ اور حیران کرتا کیونکہ وہاں مجھے اکیلے میں میرے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ گویا شاعر نہایت عاجزی اور انکساری سے کام لیتا ہے۔

Scanned with CamScanner

تنہا انصاری
غزل ۲

۱۔ تیری فرقت میں مجھ پر ہر گھڑی جو کچھ گزرتی ہے / سمجھتا خود تو ہوں لیکن تم کو سمجھانا نہیں آتا

یہ شعر تنہا انصاری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے میرے محبوب جب سے تم مجھ سے جدا ہو گئے ہو۔ میرا ہر لمحہ میرے لئے دردناک بن گیا ہے۔ اس درد جدائی سے میری کیا حالت ہو گئی ہے یہ صرف میں ہی سمجھتا ہوں۔ اس کا اظہار کرنا میرے لئے ناممکن ہے۔

۲۔ میں گل ہوں مسکراتا رہتا ہوں طوفانوں کے عالم میں / خزاں کے تند جھونکوں میں بھی مرجھانا نہیں آتا

یہ شعر تنہا انصاری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر تنہا انصاری اس شعر میں اپنے آپ کو ایک ایسے پھول کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں جو موسم خزاں کے اس ہوا میں بھی محفوظ رہتا ہے جو ہوا پھولوں کا رس چوس لیتا ہے۔ گویا شاعر ~~اس شعر میں فرماتے~~ بہادری اور حوصلہ مندی سے زندگی کے ہر آنے والی آفت اور غم کا مقابلہ کرتا ہے۔

۳۔ شکستہ ناؤ اپنی اور موجوں کا تلاطم ہے / ہو کچھ بھی ساتھیو مجھ کو تو گھبرانا نہیں آتا

یہ شعر تنہا انصاری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میری ٹوٹی ہوئی کشتی یعنی زندگی سمندر کی ان لہروں یعنی غموں اور مصیبتوں کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ جہاں سے بچ کے نکلنا بہت دشوار ہے۔ شاعر اپنے دوستوں سے کہتے ہیں کہ میں ہر آنے والی مصیبت اور غم کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں کیونکہ گھبرانا اور ڈرنا میری فطرت نہیں ہے۔ گویا شاعر اس سمندری طوفان کا ڈٹ کے مقابلہ کرتے ہیں۔ تصوف کے اعتبار ٹوٹی ہوئی ناو کو اعمال سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دونوں اعتبار سے شاعر خود اعتمادی پر زور دیتا ہے۔

۴۔ چٹانوں کو ہٹانا ٹھوکروں سے مجھ کو آتا ہے / مگر نازک سی امیدوں کو ٹھکرانا نہیں آتا

یہ شعر تنہا انصاری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میں راستے میں آنے والی ہر مصیبت اور رکاوٹ کا سامنا بڑی بہادری سے کرتا ہوں۔ یعنی میں کسی بھی مشکل مرحلے سے سامنا کر سکتا ہوں لیکن کسی کے نازک اور نرم خیالات اور امیدوں کو نہیں ٹھکرا سکتا۔ گویا شاعر کسی کا دل دکھا نہیں سکتا۔

۵۔ تڑپنے ہی میں لطف زندگی حاصل ہوا تنہاؔ / تڑپتا خود تو ہوں اوروں کو تڑپانا نہیں آتا

یہ شعر تنہا انصاری کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی کا سکون اور لطف صرف اذیتوں، دکھوں اور پریشانیوں میں رہ کر ہی حاصل کیا۔ میں نے ہر درد اور تکلیف کو برداشت کیا جس سے زندگی لطف اندوز ہو گئی۔ مگر میں نے اپنی زندگی میں کسی کو کوئی تکلیف اور دکھ نہیں پہنچایا اور نہ پہنچانا چاہتا ہوں۔ گویا شاعر ہر ایک کے ساتھ خندہ پیشانی اور نرم رہے رویے سے پیش آنا چاہتے ہیں۔

NOTES

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar M.A B.Ed 7889726757

Scanned with CamScanner

شورِیدہ کاشمیری

حالاتِ زندگی:-

غلام محمد ملک نام اور شورِیدہ تخلص تھا۔ قلمی نام شورِیدہ کاشمیری تھا۔ ۱۹۲۸ء میں شوپیان کے گاؤں پنجورہ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد عبداللہ ملک تھا جو زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے لیکن اپنے بیٹے کی تعلیم کا انہیں بے حد شوق تھا۔ ابتدائی تعلیم شورِیدہ نے اپنے گاؤں سے حاصل کی۔ اور بعد میں سرینگر کے اسلامیہ ہائی اسکول سے دسویں جماعت کا امتحان اعلیٰ نمبرات سے پاس کیا۔ ایس، پی کالج سرینگر سے بی، اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد محکمہ مال میں ملازم ہو گئے۔ اس محکمہ کے بعد محکمہ تعلیم میں استاد کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم، اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ڈگری کالج اننت ناگ میں لیکچرار مقرر ہوئے اور یہیں سے سبکدوش بھی ہوئے۔

۱۹۹۵ء میں نئی بستی اسلام آباد میں انتقال کیا۔

شاعرانہ خصوصیات:-

شورِیدہ کاشمیری کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کا شوق تھا۔ کالج کے زمانے سے ہی انہوں نے شاعری کی ابتدا کی۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی اردو کلاسیکی شعراء کے ساتھ ساتھ، آزاد، حالی، اور اقبال جیسے بڑے بڑے شعراء کی شعری روایات کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ اس وجہ سے آپ کے کلام میں قدامت پسندی کے ساتھ ساتھ جدت پسندی کا رجحان بھی صاف نظر آتا ہے۔ آپ نے غزل کے علاوہ نظم، قطعہ اور رباعی کے فن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر آپ غزل کے شاعر ہیں۔ آپ کی شاعری کے دو مجموعے "جوشِ جنوں" اور "جذبِ بادروں" شائع ہو چکے ہیں۔

Scanned with CamScanner

شورِیدہ کاشمیری

غزل ۱

۱۔ مستی اپنی شراب کی سی ہے　　آب و تاب آفتاب کی سی ہے

یہ شعر شورِیدہ کاشمیری کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنی مستی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میں اپنی زندگی میں بہت ہی مست ہوں۔ میری یہ مستی اور مدہوشی شراب جیسی ہے۔ میری چمک دمک سورج کی طرح ہے۔ گویا شاعر اپنی زندگی شان و شوکت سے گزار رہا ہے اور سورج کی طرح چمکتا ہے۔

۲۔ لوگ جاگے ہیں لیکن آنکھوں میں　　کیفیت اِک خواب کی سی ہے

یہ شعر شورِیدہ کاشمیری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ لوگ بظاہر بیدار ہو چکے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ بیداری کے عالم میں ہو کر بھی ایسے ہیں جیسے وہ نیند میں مست ہیں۔ گویا لوگ ابھی بھی غفلت کی دُنیا میں کھوئے ہوئے ہیں اور سوئے ہوئے ہیں اور اپنا مقصد کھو بیٹھے ہیں۔

۳۔ روز و شب ہے کوئی ورق گرداں　　حالت اپنی کتاب کی سی ہے

یہ شعر شورِیدہ کاشمیری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنی زندگی کو ایک کتاب سے تشبیہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میری حالت اس کتاب کی طرح ہے۔ جس کے ورق الٹنے والا کوئی اور ہی ہے۔ میری زندگی کا ایک ایک دن کم ہو رہا ہے اور میں موت کے قریب ہوتا جا رہا ہوں۔ گویا شاعر زندگی کی بے ثباتی کا اظہار کرتا ہے۔

۴۔ تیرے رخسار و لب کی رعنائی　　نو دمیدہ گلاب کی سی ہے

یہ شعر شورِیدہ کاشمیری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب کی خوبصورتی کا تذکرہ کرتے ہوئے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے میرے محبوب تیرے چہرے اور ہونٹوں کی ایک خوبصورتی تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح ہے۔ گویا شاعر اپنے محبوب کی نزاکت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۵۔ اب بھی کتنے فرات ہیں بے فیض　　جو چمک ہے سراب کی سی ہے

یہ شعر شورِیدہ کاشمیری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ آج کے اس جدید دور میں بھی بہت سے فرات (فرات وہ دریا ہے جس کا پانی اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بند کیا گیا) بے فائدہ اور بے معنی ہے۔ وہ کسی کی پیاس نہیں بجھا سکتے۔ بالکل اسی طرح جس طرح صحرا میں چمکتی ہوئی ریت دیکھ کر انسان کو یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید پانی ہے لیکن نزدیک پہنچ کر جب دیکھتا ہے تو وہ محض چمکتی ہوئی ریت ہوتی ہے جسے سراب کہتے ہیں جو صرف آنکھوں کا دھوکا ہوتا ہے۔
فرات کو بے فیض اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ اس کے پانی سے شہدائے کربلا اپنی پیاس نہیں بجھا سکے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ آج بھی ایسے بے فیض دریا بہت سے ہیں یعنی ایسے لوگ جو صاحب دولت ہیں لیکن ان کی دولت سے کسی غریب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے یعنی ان کی چمک بھی یعنی دولت بھی صرف اور صرف سراب جیسی ہے۔

— ۔ —

NOTES

شوریدہ کاشمیری

غزل ۲

۱۔ جلوۂ بے حجاب نے مارا   پردۂ لاجواب نے مارا

یہ شعر شوریدہ کاشمیری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب کے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب میرے محبوب کے حسین و جمیل چہرے سے پردہ ہٹا تو میں محبوب کے حسن کے جلوؤں کو دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔ اور جب اس نے اپنے چہرے کو پردے میں چھپا لیا تو وہ اور بھی زیادہ خوبصورت لگ رہا تھا۔ گویا شاعر کا محبوب انتہائی خوبصورت ہے۔

۲۔ خارزاروں سے بچ کے ہم نکلے   تیرے رُخ کے گلاب نے مارا

یہ شعر شوریدہ کاشمیری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے میرے محبوب تمہارے پاس آنے کے لئے مجھے بہت سی مشکلات اور کانٹوں کے میدانوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن اتنی تکلیف مجھے ان راستوں میں آنے والی دشواریوں اور رکاوٹوں سے نہیں ہوئی جتنی مجھے تیرے پھول جیسے نازک اور خوبصورت چہرے کو دیکھ کر ہوئی۔

۳۔ حُسن نے دل میں گھر کیا لیکن   عشق خانۂ خراب نے مارا

یہ شعر شوریدہ کاشمیری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میرے محبوب کے حسن کا عالم یہ ہے کہ وہ میرے دل میں بس چکا ہے۔ محبوب کے میرے دل میں بسنے سے میرے عشق کا جذبہ اتنی شدت اختیار کر چکا ہے کہ اس خانۂ خراب یعنی عشق نے میری زندگی کی بنیادیں ہلا کے رکھ دی۔

۴۔ نت نئے کیا سبق پڑھاتی ہے   روز و شب کی کتاب نے مارا

یہ شعر شوریدہ کاشمیری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنی زندگی کو ایک ایسی کتاب کی طرف تشبیہ دیتے ہیں جس کے ہر صفحے پر ایک نیا اور انوکھا سبق تحریر کیا گیا ہے یہ کتاب یعنی زندگی مجھے ہر دن نیا سبق پڑھاتی اور سکھاتی ہے۔ گویا انسان کی زندگی میں ہر روز نئی باتوں، نئے نئے تجربات، نئے نئے حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ زندگی (یعنی روز و شب کی کتاب) اپنا سکون کھو چکی ہے۔

۵۔ ظلمتوں کو جہاں کی شوریدہ   جلوہ آ کا آنجنابؐ نے مارا

یہ شعر شوریدہ کاشمیری کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے شوریدہ کاشمیری دنیا کی اندھیری، جہالت اور بے حیائی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے ہی دور ہوئی۔ ان کی آمد سے پہلے ساری دنیا گمراہی، جہالت اور بدکاری کے دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ ہر طرف ظلم و ستم اور بے راہ روی کا بازار گرم تھا۔ اگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں جلوہ نما نہ ہوتے تو ساری دنیا جہالت ہی میں ڈوبی رہتی گویا دنیا کو بھی نور میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں ہی ملا۔

NOTES

Scanned with CamScanner

شہریار

حالاتِ زندگی:-

شہریار کا اصلی نام کنور اخلاق محمد خان تھا۔ شہریار کے قلمی نام سے جانے جاتے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ضلع بریلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہردوئی میں حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے علی گڑھ چلے گئے۔ جہاں سے دسویں جماعت سے لے کر ایم، اے تک کے سارے امتحانات پاس کیے۔ انجمن ترقی اردو ہند میں بحیثیت لٹریری اسسٹنٹ کام کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ بے لوث محبت اخلاص اور اخلاق سے سب کے ساتھ پیش آنا آپ کا معمول تھا۔ بالآخر ۲۰۱۲ء میں علی گڑھ میں انتقال فرمایا۔

شاعرانہ خصوصیات:-

۱۹۵۵ء میں آپ کو شوقِ سخن ہوا۔ اس دنیا میں قدم رکھتے ہی ادبی حلقوں میں شہرت حاصل کر لی۔ شاعری کی فطری خصوصیات آپ میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ غزل اور نظم دونوں میں آپ کا اندازِ سخن منفرد نظر آتا ہے۔ جدیدیت کے ساتھ ساتھ وہ کلاسیکی روایت کا بھی احترام کرتے تھے۔ آپ کی غزلوں میں مصوری اور محاکات (کسی چیز کی حالت کا نقل کرنا، باہمی بات چیت) کی تشکیل نظر آتی ہے۔ وہ غزل کی فنی نزاکتوں سے بخوبی واقف تھے۔ غزل کی دنیا میں آپ کا ایک منفرد رنگ ہے۔ آپ کی غزلیں قاری کو لطف و سرور کے ساتھ ساتھ آگہی بھی عطا کرتی ہے۔ شہریار کے کلام کے مجموعے "اسمِ اعظم"، "ساتواں در"، "نیند کی کرچیاں" اور "خواب کا در بند ہے" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

Scanned with CamScanner

شہریار
غزل ۱

۱۔ زخموں کو رفو کر لیں دل شاد کریں پھر سے — خوابوں کی کوئی دنیا آباد کریں پھر سے

یہ شعر شہریار کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ ہمیں پرانے، غموں، مصیبتوں اور زخموں کو بھلا کر نئی زندگی گزار کر اپنے دل کو فرحت و مسرت کا سامان بخشنا ہوگا۔ اور ہمیں آنے والی زندگی کے لئے خوابوں کی نیا دنیا بسانی چاہئے۔ گویا شاعر دل پر لگے پرانے زخموں کو بھلا کر نئے جذبوں کے ساتھ زندگی کے لئے نیا انتظام کرنا چاہتا ہے۔

۲۔ مدت ہوئی جینے کا احساس نہیں ہوتا — دل ان سے تقاضا کر، بیداد کریں پھر سے

یہ شعر شہریار کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ انہیں اپنے محبوب کے ظلم سہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ ایک عرصہ گزر گیا کہ مجھے جینے کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ میرے محبوب نے مجھ پر ظلم و ستم ڈھانے کا سلسلہ بند کیا ہے۔ اسلئے شاعر اپنے دل سے اس بات کا اظہارِ خیال کرتا ہے کہ اس کا محبوب اگر پھر سے اس پر ظلم ڈھاتا تاکہ زندگی کو راحت اور سکون مل جاتا۔ گویا شاعر کو اپنے محبوب کے ظلم و ستم سے ہی زندگی پر سکون لگتی ہے۔

۳۔ مجرم کے کٹہرے میں پھر ہم کو کھڑا کر دو — ہو رسمِ کہن تازہ، فریاد کریں پھر سے

یہ شعر شہریار کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں دورِ حاضر کے حالات و واقعات سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ ہمیں پھر سے پرانی رسموں اور رواجوں کی طرف لوٹا کر مجرم کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے تاکہ ہم اپنے اوپر کئے ہوئے ظلم و ستم کے لئے انصاف مانگ سکیں۔ گویا شاعر موجودہ دور کے نظام سے بالکل بھی مطمئن نہیں ہے بلکہ بیتے ہوئے وقت کے حالات کو عصری کرب پر ترجیح دیتے ہیں۔

۴۔ اے اہلِ جنوں دیکھو زنجیر ہوئے سائے — ہم کیسے انہیں، سوچو آزاد کریں پھر سے

یہ شعر شہریار کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے ہم عصر ساتھیوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے میرے ہم عصر دوستو! ہمارے اوپر زنجیروں یعنی غموں اور پریشانیوں نے اپنے سائے کئے ہوئے ہیں گویا ہم قیدی بن گئے ہیں۔ شاعر اپنے ساتھیوں کو بیداری کی دعوت دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ہمیں ان زنجیروں یعنی مصیبتوں اور تکلیفوں کے سایوں سے نکلنے یعنی آزاد ہونے کی کوئی تدبیر اور صورت نکالنی ہوگی تاکہ ہم زندگی کو پرسکون گزار سکیں۔

۵۔ اب جی کے بہلنے کی ہے ایک یہی صورت — بیتی ہوئی کچھ باتیں ہم یاد کریں پھر سے

یہ شعر شہریار کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ موجودہ دور کے حالات ہی کچھ ایسے ہیں کہ ان سے خوشی کا کوئی سامان میسر نہیں ہوتا۔ ہم موجودہ دور میں میسر ہونے والی چیزوں سے کوئی خوشی اور مسرت حاصل نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنی اپنی زندگی خوشحالی اور شادمانی سے گزارنے کے لئے گزرے ہوئے لمحوں اور باتوں کو یاد کرنا چاہئے۔ گویا شاعر کو موجودہ زمانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ گزرے ہوئے لمحوں کو ہی اپنے سکون کا سبب تصور کرتے ہیں

NOTES

May 2014	M	T	W	T	F	S	S
				1	2	3	4
	5	6	7	8	9	10	11
	12	13	14	15	16	17	18
	19	20	21	22	23	24	25
	26	27	28	29	30	31	

June 2014	M	T	W	T	F	S	S
	30						1
	2	3	4	5	6	7	8
	9	10	11	12	13	14	15
	16	17	18	19	20	21	22
	23	24	25	26	27	28	29

شہریار

غزل ع۲

۱۔ زندگی جیسی توقع تھی، نہیں کچھ کم ہے — ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے

یہ شعر شہریار کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ ہم نے زندگی سے جو امیدیں باندھی تھی ویسا ہم نے کچھ نہیں پایا جس کا احساس ہر وقت میرے دل میں کھٹکتا رہتا ہے۔ گویا زندگی سے جو بھی امیدیں رکھی جاتی ہے ویسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ہوتا وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوتی ہے۔

۲۔ گھر کی تعمیر تصور ہی میں ہو سکتی ہے — اپنے نقشے کے مطابق یہ زمین کچھ کم ہے

یہ شعر شہریار کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ ہم نے اپنے خیالوں میں اپنے مکان کے لئے جو نقشہ بنا کے رکھا تھا اس کے مطابق ہماری زمین بہت کم نکلی۔ جس گھر کو ہم نے خیالوں میں سجایا تھا اس کو اس ظالم دنیا نے بنانے میں سے محروم رکھا۔ گویا اپنے خیالات کو اس دنیائے فانی میں حقیقی شکل دینا بہت مشکل ہے۔

۳۔ بچھڑے لوگوں سے ملاقات کبھی پھر ہوگی — دل میں امید تو کافی ہے یقین کچھ کم ہے

یہ شعر شہریار کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے بچھڑے ہوئے لوگوں کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو لوگ ہم سے دور ہو گئے ہیں تو زندگی میں ان لوگوں کے ساتھ کسی نہ کسی موڑ پر ملاقات ہو سکتی ہے۔ لیکن یقین پورا نہیں ہوتا کہ وہ لوگ ملیں گے بھی یا نہیں ہم صرف امیدیں لگا سکتے ہیں۔ گویا یہ دنیا امیدوں پر ہی قائم و دائم ہے۔

۴۔ اب جدھر دیکھیے لگتا ہے کہ اس دنیا میں — کہیں کچھ چیز زیادہ ہے کہیں کچھ کم ہے

یہ شعر شہریار کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ ہم اگر اس دنیا میں کسی بھی طرف اپنی نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں بہت سی چیزیں ضرورت سے زیادہ اور کہیں کچھ چیزیں ضرورت سے بالکل کم نظر آتی ہیں۔ گویا اس دنیا میں کہیں برابری نہیں ہے۔ اور مساوات اس دنیا میں زندگی کے کسی بھی مرحلے میں موجود نہیں ہے۔

۵۔ آج بھی ہے تری دوری ہی اداسی کا سبب — یہ الگ بات کہ پہلی سی نہیں کچھ کم ہے

یہ شعر شہریار کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے محبوب سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے میرے محبوب میری اداسی اور بے چینی کا سبب ہمیشہ تمہاری جدائی رہی ہے۔ میں تمہاری جدائی میں ہمیشہ خون کے آنسوؤں روتا رہا۔ میں آج بھی تمہاری وجہ سے ہی بے قرار اور بے سکون ہوں مگر جتنا اداس اور پریشان میں پہلے ہوتا تھا اتنا اداس آج نہیں ہوں۔ مگر پھر بھی تمہاری دوری ہی کی وجہ سے آج بھی تھوڑا اداس رہتا ہوں

~~~ ✗ ~~~

Scanned with CamScanner
~~~

عابد مناوری

حالاتِ زندگی:-

اصلی نام گوری نندن بالی اور عابد تخلص تھا۔ ۱۹۳۸ء کو جموں میں پیدا ہوئے۔ مناور آپ کا آبائی وطن تھا۔ ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے کالج میں داخلہ لیا لیکن تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ ۱۹۵۶ء میں حکومت کے محکمہ پنچایت میں ملازم ہوئے۔ بعد میں حکومت کے مختلف محکموں میں بطور اکاونٹس آفسر اپنے خدمات انجام دیں۔

شاعرانہ خصوصیات:-

عابد مناوری نے شاعری کا آغاز کالج کے آخری دنوں میں کیا۔ ان کی پہلی غزل ۱۹۶۱ء میں منظرِ عام پر آ گئی۔ عابد مناوری کی غزلیں متنوع مضامین کی حامل ہیں۔ انسانی تجربات کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہوگا جسے ان کے کلام میں نہ دیکھا جا سکے۔ ان کے اسلوب کی سب سے اہم خصوصیت سادگی ہے۔ انہوں نے نازک جذبات کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا۔ چھوٹی بحروں میں لکھی گئی ان کی غزلیں قابلِ تعریف و تحسین ہیں۔ غزلوں کی نئی روایات سے بھی انہوں نے استفادہ کیا۔ ان کی غزلوں کا پہلا مجموعہ "بہارِ غزل" کے عنوان سے شائع ہوا۔ جس پر انہیں ریاستی کلچرل اکاڈمی کی طرف سے سال کی بہترین تخلیق ہونے کا اعزاز بھی ملا۔ ان کی غزلوں کے دوسرے مجموعے پر "شمیمِ گل" پر بھی انہیں ریاستی کلچرل اکاڈمی کی طرف سے انعام ملا۔ اس کے بغیر ان کی غزلوں کے دو اور مجموعے "رِم جھم" اور "جود یوانگری" رسم الخط میں لکھا گیا اور "برجستہ" بھی منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ غزلوں کے علاوہ کشمیر سے متعلق ان کی نظموں کا مجموعہ "اے جنتِ کشمیر" کے نام سے شائع ہوا۔

عابد مناوری
غزل ۱

۱۔ باطن کی آنکھ سے جو کبھی دیکھتا ہوں میں — لگتا ہے جیسے خود سے بھی نا آشنا ہوں میں

یہ شعر عابد مناوری کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے اندرون کو بیدار کرتا ہوں یعنی اپنی دل کی آنکھوں سے اپنے اندر جھانک کر دیکھتا ہوں تو مجھے اپنا وجود بھی نظر نہیں آتا یعنی میں خود سے بھی بے خبر اور ناواقف ہوں اور میں اپنے آپ کو بھول جاتا ہوں۔

۲۔ اس در سے خالی ہاتھ ہی پلٹا ہے ہر کوئی — دست سوال لے کے کہاں آ گیا ہوں میں

یہ شعر عابد مناوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اس بے وفا دنیا میں کوئی کسی کی مدد اور ہمدردی کے لئے تیار ہی نہیں ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ میرے محبوب کے دروازے سے ہر کوئی خالی ہاتھ لوٹ آیا ہے۔ میرے محبوب نے کسی کو بھی اپنے دل میں جگہ نہیں دی۔ اب شاعر خود سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میں ہاتھ پھیلا کر محبت کی بھیک مانگنے اس در پر کیوں آیا جہاں سے ہر کوئی نا امید ہی واپس لوٹا ہے۔

۳۔ مجھ کو ہوا اڑا کے جدھر چاہے لے چلے — پتا ہوں اور شاخ سے ٹوٹا ہوا ہوں میں

یہ شعر عابد مناوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے آپ کو ایک ٹہنی سے گرے ہوئے پتے کی طرف مشابہت دے کر کہتا ہے کہ میں خزاں رسیدہ پتے کی مانند ہوں مجھے ہوا یعنی زمانے کی مصیبتیں اور سختیاں جہاں چاہے لے جائیں۔ گویا شاعر دنیا کے دئے ہوئے غم برداشت نہیں کر سکتا۔

۴۔ مجھ سا بھی سادہ لوح زمانے میں ہے کوئی — اپنی تباہیوں پر بھی خوش ہو رہا ہوں میں

یہ شعر عابد مناوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ مجھ سا بھی سیدھا سادہ انسان اس جہاں میں کوئی ہوگا جو اپنی تباہی اور بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی خوش ہو رہا ہو۔ جہاں لوگ اپنے لئے کامیابی کے نئے نئے راستے ڈھونڈتے ہیں وہاں جو شخص اپنی ناکامی، تباہی اور بربادی دیکھ کر خوش ہوتا ہو یقیناً وہ سیدھا سادہ انسان ہی ہوگا۔

۵۔ ہے ٹھیک یا غلط میرا اندازِ گفتگو — عابدؔ جو کہنا تھا مجھے وہ کہہ گیا ہوں میں

یہ شعر عابد مناوری کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میرے بات کرنے کا انداز چاہئے غلط یا صحیح ہے۔ مجھے جو بات کہنی تھی وہ میں نے کہہ دی۔ اب کوئی میری بات کو کوئی غلط قرار دے یا صحیح مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

Sunday 01

NOTES

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar M.A B.Ed 7889726757

Scanned with CamScanner

عابد مناوری

غزل نمبر ۲

۱- میرے آنگن سے کبھی ہو کے نہ گزرا سورج — راستہ اپنا کسی دن تو بدلتا سورج

یہ شعر عابد مناوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ مجھے ہر طرف غموں اور پریشانیوں نے گھیرا ہے۔ میرے دل کے آنگن اور میری زندگی کے آنگن میں کبھی بھی سورج نہیں چمکا۔ یعنی میں نے زندگی ہمیشہ غموں اور پریشانیوں میں ہی گزاری ہے۔ میری زندگی میں کبھی بھولے سے بھی کوئی خوشی نہیں آئی ہے۔ گویا شاعر نے اپنی زندگی غموں اور ناامیدی میں گزاری ہے۔

۲- دن جو نکلا بھی تو چھائے رہے غم کے بادل — دل کی نگری پہ کبھی کھل کے نہ چمکا سورج

یہ شعر عابد مناوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اگر کبھی بھی مجھے ہلکی سی ~~فرماتے ہیں کہ~~ کوئی خوشی محسوس ہوتی ہے لیکن اچانک غموں کے بادل اس کے گرد منڈلاتے ہیں۔ میرے دل میں کبھی بھی کوئی دائمی خوشی نہیں آئی ہے۔ گویا شاعر نے ساری زندگی ہمیشہ غموں اور پریشانیوں میں گزار دی ہے۔

۳- قہقہہ زن ہے مری ہار پہ دشمن میرا — پردۂ شب سے پھر ایک بار نکل آ سورج

یہ شعر عابد مناوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں سورج یعنی خوشیوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ میری ہار پر میرا دشمن کھل کھلا کر ہنستا ہے اور خوشیاں مناتا ہے جو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ اسلئے اے سورج یعنی اے خوشی تو آ کر میرے غموں کی اس اندھیری رات کے پردوں کو ہٹا دے اور میری زندگی کو بھی چمکا دے۔

۴- اک طرف رات کے شیدا مہ و انجم کتنے — اک طرف دن کا اکیلا پرستار اکیلا سورج

یہ شعر عابد مناوری کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر قدرت کے نظام کا نقشہ ایک بہترین انداز میں کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جب رات آتی ہے تو رات کے اندھیرے کو دور کرنے کے لئے اس کے لاتعداد عاشق یعنی چاند اور ستارے آتے ہیں۔ لیکن جونہی دن نکل آتا ہے تو اکیلا سورج پوری دنیا کو اپنی روشنی سے منور کر دیتا ہے۔ قدرت کا کیسا یہ دلفریب منظر ہے کہ رات کے چاہنے والے لاکھوں ستارے اور دن کا عاشق اکیلا سورج ہے۔

۵- غیر ممکن ہے شبِ غم کی سحر اے عابد — کس نے مغرب سے نکلتے ہوئے دیکھا سورج

یہ شعر عابد مناوری کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے عابد تیرے غموں کی رات کا صبح ہونا یعنی غموں کا خوشی میں بدل جانا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا مغرب سے سورج کا طلوع ہونا ناممکن ہے۔ یعنی شاعر کی زندگی میں خوشیوں اور شادمانیوں کا آنا بہت مشکل ہے

~ * ~

پرتپال سنگھ بیتاب

حالاتِ زندگی:-

پرتپال سنگھ نام اور بیتاب تخلص ۱۹۴۹ء کو پونچھ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سردار پریم سنگھ ہے۔ گورنمنٹ پرائمری اسکول پونچھ میں داخلہ لینے کے فوراً بعد ان کے گھر والے فیروز پور پنجاب چلے گئے اور وہی ہائر سیکنڈری اسکول میں داخلہ لیا۔ جہاں نویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد جموں آ گئے۔ رنبیر ہائر سیکنڈری جموں سے انٹرمیڈیٹ اور جی، جی، ایم کالج جموں سے بی، اے ایس، سی کے امتحانات پاس کئے۔ جموں یونیورسٹی سے سیاسیات میں ایم، اے کرنے کے بعد ۱۹۷۵ء میں ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۷۷ء میں انہوں نے کے، اے، ایس کا امتحان کیا اور انڈر سیکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔ بیتاب ترقی کرتے کرتے کمشنر سیکریٹری کے عہدے تک پہنچ گئے اور ۲۰۰۸ء میں ریٹائر ہو گئے۔ بیتاب آج کل جموں میں شعر و سخن کی محفلوں کی جان بنے ہوئے ہیں۔

شاعرانہ خصوصیات:-

بیتاب کو طالبِ علمی کے زمانے سے ہی شاعری کا شوق تھا۔ ملازمت کے زمانے میں باقاعدہ شعر کہنے لگے۔ ان کی شاعری جدید دور میں انسان کے المیہ کو بیان کرتی ہے۔ انسان کی تنہائی، بے بسی کے علاوہ، قدروں سے انحراف اور رشتوں کی بے یقینی کا ماتم ان کی غزلوں میں نمایاں ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "پیش خیمہ" ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے بہت سارے شعری مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں جن میں "سراب در سراب"، "خود رنگ"، "موج ریگ" "شہرِ غزل" خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی شعری خدمات پر ان کو جموں و کشمیر کلچرل اکادمی انعام، صادق میموریل انعام، بخشی غلام محمد میموریل انعام کے علاوہ بہت سارے دوسرے انعامات بھی ملے ہیں۔

April 2014

M	T	W	T	F	S	S
	1	2	3	4	5	6
7	8	9	10	11	12	13
14	15	16	17	18	19	20
21	22	23	24	25	26	27
28	29	30				

May 2014

M	T	W	T	F	S	S
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30	31	

پرتپال سنگھ بیتاب

غزل ۱

۱۔ نہ دے پختہ عمارت اک کھنڈر دے
میں بے گھر ہوں مجھے بھی کوئی گھر دے

یہ شعر بیتاب کی غزل کا مطلع ہے۔ شاعر اس شعر میں اللہ سے دُعا گو ہو کر کہتا ہے کہ میں اس ترقی یافتہ زمانے میں بھی ایک چھوٹے سے جھونپڑے کی تمنا کرتا ہوں۔ الہٰی میں کسی پختہ عمارت یعنی عالیشان عمارت کی خواہش نہیں کرتا ہوں۔ گویا شاعر اس پتھروں سے بنی دنیا سے تنگ آکر ایک کھنڈر کا ارمان کرتا ہے۔

۲۔ اگر ہوں راستے پر مطمئن کر
اگر بے سمت ہوں راہِ سفر دے

یہ شعر بیتاب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اللہ تعالیٰ کے دربار میں دعا مانگتا ہے کہ اے میرے خدا اگر میں نے اپنی زندگی کے سفر کے لئے صحیح راستہ چن لیا ہے تو مجھے الہامی طور پر اطمینان بخش دے۔ اور اگر میں کسی ایسے راستے پر چلتا ہوں جس سے مجھے بھٹکنے کا خطرہ ہے تو میرے لئے ان راستوں کو کھول دے جن پر چل کے میں اپنی زندگی میں کامیابی حاصل کر سکوں۔

۳۔ نہ دے اونچائی میرے قد کو بے شک
مری ہر شاخ کو لیکن ثمر دے

یہ شعر بیتاب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا مانگتا ہے کہ تو نے مجھے قدآور بنا دیا ہے۔ شاعر خود کو ایک قدآور درخت سے مشابہت دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ تعالیٰ سے دعا مانگتا کہ اے اللہ اگر تو میرے اس قد کو اونچائی نہیں دے گا لیکن میری ہر شاخ کو پھل اور پھول سے نواز دے۔ گویا شاعر اپنی آنے والی ہر اولاد کے لئے دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ میرے اولادوں کو دولت اور عزت سے مالامال کر دے۔

۴۔ مجھے پتھر ہی پتھر دے دئے ہیں
اب ان ہاتھوں کو آزر کا ہُنر دے

یہ شعر بیتاب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے کہ اے اللہ مجھے اس زمانے نے صرف پتھر ہی پتھر دئے ہیں۔ یہ پتھر میرے کسی کام کے نہیں ہیں۔ اے اللہ اب میرے ان ہاتھوں کو آزر یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے چچا کا ہُنر مجھے دے۔ تاکہ میں اس ہُنر کی فن کاری سے ان پتھروں کو تراش کر اپنی زندگی کا کارواں آگے بڑھا سکوں گا۔

۵۔ نظر بے منتظر ہے نس نس ہے بیتاب
صدف مجھ کو کیا ہے تو گُہر دے

یہ شعر بیتاب کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ میری ہر نظر بیقرار اور میری رگ رگ بے سکون ہے اب میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے صدف (تجوری) یعنی خوبصورت دل عطا کیا ہے۔ لیکن یہ خالی تجوری یعنی یہ میرا دل میرے کس کام کا ہے جب تک تو اس دل کو اپنے فضل و کرم سے نواز نہ دے گا۔ اب اس تجوری کو لال و جواہرات یعنی اس دل کو اپنی رحمت کی دولت سے مالامال کر دے۔

NOTES

پرتپال سنگھ بیتاب
غزل ۲

۱۔ ریت ہے اور بیکرانی ہے
اور صحرا کی کیا کہانی ہے

یہ شعر بیتاب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں دنیا کو بے کنارا کہتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس طویل دنیا میں کسی کو بھی میں اپنے لئے مددگار اور ہمدرد نہیں سمجھ سکتا کیونکہ یہ دنیا محض ایک فریب ہے اور کچھ نہیں۔ یہ دنیا ایک ریگستان جیسا ہے۔

۲۔ کھول کر دیکھ در مکانوں کے
لامکانی ہی لامکانی ہے

یہ شعر بیتاب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ دور سے دکھنے والا مکان ہمیں عالیشان اور شاندار نظر آتے ہیں۔ لیکن جب ہم ان مکانوں کے دروازے کھول کر ان کے اندر جھانک کر دیکھتے ہیں تو لامکانی سی محسوس ہوتی ہے۔ یہاں کوئی کسی کی ہمدردی کے لئے تیار ہی نہیں ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنے مطلب کا طلبگار ہے۔

۳۔ راستہ کس سے مانگتے ہو یہاں
بھیڑ نے کس کی بات مانی ہے

یہ شعر بیتاب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں فرماتے ہیں کہ اس وسیع اور عریض دنیا کی بھیڑ میں تم کس سے صحیح راستہ مانگتے ہو۔ یہاں کوئی کسی کو راہ دکھانے کے لئے تیار ہی نہیں۔ یہاں سب لوگ اپنے اپنے کاروبار میں مصروف ہے وہ بھلا کسی کو کیا راستہ دکھائیں گے۔

۴۔ اپنے قدموں کے نقش غائب ہیں
بے نشانی سی بے نشانی ہے

یہ شعر بیتاب کی غزل سے لیا گیا ہے۔ شاعر اس شعر میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر نہایت دلکش انداز میں کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہاں کتنے عظیم اور جاہ و جلال والے انسان آئے ہیں۔ ہر کوئی موت کا جام پی کر واپس چلا گیا اور آج ان کا نام و نشان تک موجود نہیں ہیں۔ لٰہذا ہمیں بھی ایک دن اس فانی دنیا کو الوداع کرنا ہوگا اور پھر یہاں بے نشانی سی محسوس ہوگی۔

۵۔ ہمیں کچھ رک سے گئے ہیں بیتاب
ورنہ چاروں طرف روانی ہے

یہ شعر بیتاب کی غزل کا مقطع ہے۔ شاعر اس شعر میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے بیتاب یہ ساری دنیا اور یہاں رہنے والے لوگ اپنے کاروبار میں مگن ہے۔ ہر کوئی اپنا اپنا کام سرانجام دے رہا ہے ایک ہم ہیں جو اس ترقی یافتہ اور مشینی دور میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں۔ یعنی میرے بغیر سب لوگ اپنی زندگی سکون اور اطمینان سے گزار رہے ہیں۔

NOTES

Scanned with CamScanner

"غزلیات" سوالات (فراق گورکھپوری)

سوال 1:- غزل نمبر ایک کے دوسرے شعر میں "مسافروں سے کہو۔۔۔۔" سے کون سے مسافر مراد ہیں ؟
جواب :- غزل نمبر ایک کے دوسرے شعر میں "مسافروں سے کہو" سے مراد آزادی وطن کے مسافر یعنی اپنے وطن پر جان قربان کرنے والے ہیں۔

سوال 2:- دوسری غزل کے مقطع میں احباب کا مجمع ہونے کے باوجود خاموشی کی کیا وجہ بیان کی گئی ہے ؟
جواب :- دوسری غزل کے مقطع میں احباب کا مجمع ہونے کے باوجود خاموشی کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ اس محفل میں فراقؔ موجود نہیں ہے۔ اگر فراق اس محفل میں موجود ہوتے تو وہ اپنا کلام سناتے اور محفل کی خاموشی ختم ہو جاتی۔

سوال 3:- اشاروں میں ہونے والی بات کا شرحِ حیات ہو جانے سے کیا مراد ہے ؟
جواب :- اشاروں میں ہونے والی بات کا شرحِ حیات ہو جانے سے مراد ہے کہ جب عاشق نے اپنے معشوق سے اشاروں میں باتیں کیں تو ایک دوسرے کو اپنے دل کی باتیں کہہ دی۔ اور عاشق نے اپنے محبوب کی ملاقات کو اپنی زندگی کا مقصد بنا دیا۔

سوالات میر غلام رسول نازکیؔ

سوال 1:- سیلابِ تبسم کی وضاحت کیجئے ؟
جواب :- سیلابِ تبسم کے معنی ہے مسکراہٹ کی سیلاب۔ یعنی محبوب کی مسکراہٹ اتنی فراواں اور رواں ہوتی ہے کہ ہر چیز کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتی ہے۔

سوال 2:- شاعر کی نظر میں دنیائے محبت کی کون سی چیز نرالی ہے ؟
جواب :- شاعر کی نظر میں محبت کے دنیا کی ہر چیز نرالی اور انوکھی ہوتی ہے۔ خاص کر یہ بات انوکھی اور نرالی ہے جب عاشق اور معشوق کے درمیان خاموشی سے اشاروں میں باتیں ہوا کرتی ہے جن کو کوئی تیسرا سمجھ نہیں سکتا۔

سوال 3:- گوشۂ تنہائی سے کیا مراد ہے ؟
جواب :- گوشۂ تنہائی سے مراد ہے تنہائی اختیار کرنا۔ یعنی ایسی تنہائی جہاں کسی کا کوئی مکمل دخل نہ ہو۔

سوال 4:- "لذتِ رسوائی" اور "رسوائے محبت" کی وضاحت کیجئے ؟
جواب :- لذتِ رسوائی سے مراد ہے جب عاشق اپنے معشوق کی محبت اور عشق میں رسوا ہو جاتا ہے تو وہ اس رسوائی کو بھی عشق کی سوغات یعنی تحفہ سمجھتا ہے جس سے وہ لذت اور مٹھاس محسوس کرتا ہے۔

رسوائے محبت سے مراد ہے کہ محبت میں جب عاشق معشوق کی جانب سے ناکام ہو کے لوٹتا ہے۔ یعنی معشوق اس کی قدر دانی نہیں کرتا اور پھر وہ رسوا اور بدنام ہو جاتا ہے۔

Scanned with CamScanner

سوالات :- فیض احمد فیض

سوال 1 :- فیض کی شاعری کا موضوع کیا ہے ؟

جواب :- فیض کی شاعری چونکہ انقلابی آہنگ رکھتی ہے ۔ ان کی شاعری کا موضوع گل وبلبل، حسن و عشق، رقص وطرب کے لباس میں ایک ایسے نظام کو قائم کرنے کی آرزو اور تمنا ہے جس میں مظلوموں کی شنوائی ہو ۔ فیض عوام کی محرومیوں کو اپنی شاعری کے ذریعے زبان عطا کرتے ہیں ۔

سوال 2 :- فیض کی ان غزلوں میں قفس اور چمن، بار رات اور سحر کے الفاظ ان معنوں میں استعمال نہیں ہوئے ہیں جن معنوں میں یہ عام طور پر اردو غزل میں استعمال ہوتے رہے ہیں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ فرق کیا ہے ؟

جواب :- فیض کی ان غزلوں میں قفس قید خانے کو، چمن ملک و وطن کو، رات ظلم کے اندھیرے کو، اور سحر حق پرستی پر مبنی نظام کو کہا گیا ہے ۔ جبکہ روایتی اردو غزل میں قفس پنجرے کو چمن شاعر کے گھر کو، رات محبوب کی جدائی کو اور سحر محبوب کے ملاقات کی علامات سمجھی جاتی ہے ۔ یہ باتیں ذہن میں رکھی ~~جلے~~ جائے تو فیض کی شاعری کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے ۔

سوال 3 :- بادِ نوبہار، کنجِ لب، شبِ ہجراں، قامتِ جانانہ تراکیب ہیں۔ لفظوں کو اضافت سے ملایا جائے تو ترکیب بن جاتی ہے ۔ اس طرح کی فارسی تراکیب کا استعمال اردو شاعری میں عام ہو رہا ہے ۔ آپ مزید پانچ اور تراکیب لکھئے ؟

جواب :- بہرِ خدا، سوئے دار، کوئے یار، دیدۂ تر، سرِ کاکل، فصلِ گل، صبحِ سخن، دفترِ جنوں وغیرہ

سوالات :- تنہا انصاری

سوال 1 :- مداوا سے کیا مراد ہے ؟

جواب :- مداوا کے معنی علاج یا دوا کے ہیں ۔ شاعر نے اس لفظ کو دردِ دل کے علاج کے ساتھ تعبیر کیا ہے ۔

سوال 2 :- شاعر کو پرسشِ اعمال کا خیال کیوں خوفزدہ کرتا ہے ؟

جواب :- شاعر کو پرسشِ اعمال کا خیال اسلئے خوفزدہ کرتا ہے کیونکہ اس کے مطابق اس نے اپنی زندگی میں کوئی نیک عمل کیا ہی نہیں جن کے بارے میں اسے قیامت کے دن پوچھا جائے گا ۔ وہ خود کو گنہگار سمجھتا ہے اس لئے وہ قیامت سے ڈرتا ہے ۔

سوال 3 :- خزاں کے تند جھونکوں سے کیا مراد ہے ؟

جواب :- خزاں کے تند جھونکوں سے مراد ہے موسم خزاں کی وہ ہوا جو پھولوں کا رس چوس لیتی ہے اور انہیں مرجھا ڈالتی ہے ۔ شاعر نے ان الفاظ کو مشکلات، مصائب اور دکھوں کے ساتھ تعبیر کیا ہے ۔

Scanned with CamScanner

April 2014						
M	T	W	T	F	S	S
	1	2	3	4	5	6
7	8	9	10	11	12	13
14	15	16	17	18	19	20
21	22	23	24	25	26	27
28	29	30				

May 2014						
M	T	W	T	F	S	S
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30	31	

سوال 4:۔ شاعر نے موجوں کے تلاطم کے ساتھ شکستہ ناؤ استعمال کر کے کس بات پر زور دینا چاہا ہے؟
جواب:۔ شاعر نے دنیا کے آفات اور مصیبتوں کو موجوں کے تلاطم کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ شکستہ ناؤ سے مراد وہ ٹوٹی ہوئی کشتی ہے جو ان مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک ذریعہ ہے۔ دنیاداری کے لحاظ سے اسے زندگی کے وسائل سے اور تصوف کے اعتبار سے اسے اعمال کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

سوالات:۔ شوریدہ کاشمیری

سوال 1:۔ شاعر نے دریائے فرات کو بے فیض کیوں بتایا ہے؟
جواب:۔ دریائے فرات ایک مشہور دریا ہے جو کربلا میں موجود ہے۔ اس پر یزید کی فوج نے پہرہ بٹھائے رکھا تھا۔ اس دریا کے موجود ہونے کے باوجود بھی اس کے پانی سے امام حسین رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی پیاس نہ بجھ سکی۔ اس لئے اس کو بے فیض بتایا گیا ہے۔
سوال 2:۔ سراب کو دھوکے اور فریب کے معنوں میں کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟
جواب:۔ ریگستان میں چمکتی ہوئی ریت دیکھ کر انسان کو پانی کا گمان ہوتا ہے جب انسان نزدیک پہنچتا ہے تو وہاں ریت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ آنکھوں کا دھوکا ہوتا ہے۔ اس لئے سراب کو فریب اور دھوکے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔
سوال 3:۔ روز و شب کی کتاب سے کیا مراد ہے؟
جواب:۔ روز و شب کی کتاب سے مراد زندگی جو دنوں اور راتوں کے سلسلوں سے بنی ہوئی ہے۔
سوال 4:۔ شاعر کے نزدیک ظلمتوں کو کس نے مارا؟
جواب:۔ شاعر کے نزدیک ظلمتوں کو حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے تولد ہونے کی وجہ سے رخصت ہوا۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت نے ہی ظلمتوں یعنی اندھیروں کو الوداع کیا۔

سوالات:۔ شہریار

سوال 1:۔ خوابوں کی دنیا آباد کرنے کے لئے کیا کرنا ہوگا؟
جواب:۔ خوابوں کی دنیا آباد کرنے کے لئے پرانے زخموں پر مرہم کر کے اپنے دل کو شاد کرنا ہوگا۔

NOTES

سوال 2:۔ دل بہلانے کی کیا صورت ہے؟
جواب:۔ دل بہلانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ بیتی ہوئی باتوں کی یادوں کو اپنے دل میں تازہ کرنا ہے۔
سوال 3:۔ غزل نمبر دو کے آخری شعر کو پڑھ کر بتائیے کہ شاعر کی اداسی کا سبب کیا ہے؟
جواب:۔ غزل نمبر دو کے آخری شعر میں شاعر کی اداسی کا سبب اس کے محبوب کی دوری یعنی جدائی ہے۔

Scanned with CamScanner

سوال 4:۔ درج ذیل لفظوں کو جملوں میں استعمال کیجیے۔
جواب:۔ احساس :۔ تمہاری مدد کا مجھے احساس ہے۔ یقین:۔ مجھے تمہاری باتوں پر یقین ہے۔
تصور :۔ اللہ کا تصور ہمیشہ دل میں رکھو۔ تقاضا:۔ دکان دار نے آج بقایات پیسوں کا تقاضا کیا۔
مجرم :۔ مجرم کو عدالت سے رہا کیا گیا۔ زنجیر:۔ قیدیوں کے پاؤں میں زنجیریں تھی۔

"عابدؔ مناوری" سوالات

سوال 1:۔ شاعر اپنے آپ کو خود سے نا آشنا کب پاتا ہے؟
جواب:۔ شاعر اپنے آپ کو خود سے نا آشنا یعنی بے خبر تب پاتا ہے جب وہ دل کی آنکھ سے اپنے اندر جھانک کر دیکھتا ہے۔
سوال 2:۔ شاعر دستِ سوال لے کے کہاں جاتا ہے؟
جواب:۔ شاعر محبوب کے در پر دست سوال یعنی سوال کے لئے ہاتھ پھیلائے ہوئے جاتا ہے جہاں سے ہر کوئی نامراد ہی واپس لوٹتا ہے۔
سوال 3:۔ شاعر اپنی تباہیوں پر خوش کیوں ہے؟
جواب:۔ شاعر اپنی سادگی کی وجہ سے اپنی تباہیوں پر خوش ہوتا ہے۔
سوال 4:۔ مہ و انجم کس کے شیدائی ہیں؟
جواب:۔ مہ و انجم یعنی چاند اور ستارے رات کے شیدائی یعنی عاشق ہیں۔

~~~ ~~~

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar M.A B.Ed 7889726757

Scanned with CamScanner
~~~

page 27 — 46

Monday

(غزل کے لغوی معنی "عورتوں سے باتیں کرنا" یا "عورتوں کے متعلق باتیں کرنا" کے ہیں

"غزل"

معنی کے اعتبار سے غزل اس کلام کو کہتے ہیں جس میں عورتوں کے حسن و عشق کا ذکر ہو۔ غزل شاعری کی وہ قسم ہے جس میں عشق کی کہانی خود عاشق کی زبان سے بیان کی جائے۔ لیکن اصنافِ ادب میں غزل اس نازک صنف کا نام ہے جس میں عشق و محبت، حسن و جمال، گل و بلبل کے تذکرے، معشوق کے خد و خال کی تعریف، اس کے جور و ستم، بے توجہی، ہجر و فراق کی تڑپ، بے چینی، بے قراری، وصالِ محبوب کی تمنا، رقیب سے شکوہ اور شادی و غم کے مضامین اکثر و بیشتر بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن وقت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اردو غزل نے بھی اپنے مزاج میں تبدیلی کو پسند کیا۔ اب ہجر و وصال کی دکھ بھری داستان کے ساتھ غزل کے موضوعات میں وسعت پیدا ہوگئی تو فلسفہ حیات، مذہبیات، مسائلِ انسانی، دقیق خیالات (نازک یا باریک) اور سنجیدہ مضامین بھی غزل کے موضوعات بن گئے۔ جب غور سے دیکھا جائے تو غزل وہی ہے جو پہلے تھی وہی غزل جس کی ابتدا عرب سے ہوئی۔ وہاں سے نکل کر ایران پہنچی تو فارسی نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا

غزل کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کا ہر شعر دوسرے شعر سے مضمون یا معنی کے اعتبار سے جدا جدا ہوتا ہے۔ شاعر اس میں وہی بیان کرتا ہے جو اس کے دل پہ گزرتی ہے۔ اور اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ غزل کو پیش کرتے وقت غزل گو عام طور پر شیریں الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ غزل کو عموماً اپنی ہیئت کے اعتبار سے اردو شاعری کی پہچان سمجھا جاتا ہے۔ جو شعراء کافی مشاہدہ، گہرا خیال اور بلند نظر رکھتے ہیں کامیاب غزل گو ہو سکتے ہیں۔ غزل اردو شاعری کی سب سے زیادہ دلچسپ اور مقبولِ عام صنفِ سخن ہے۔ یہ غزل ہی ہے جس نے اردو شاعری کو عالمی شاعری کے لئے ہم پلہ بنا دیا۔

غزل کے پہلے شعر کو "مطلع" کہتے ہیں۔ اس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ، ہم ردیف اور ہم بحر ہوتے ہیں۔ غزل میں جس طرح مضامین کی کوئی قید نہیں اسی طرح اشعار کی بھی کوئی خاص تعداد مقرر نہیں۔ عام طور پر پانچ سے انیس اشعار تک کی غزلیں ہوتی ہے۔ لیکن کئی غزلوں میں اس سے زیادہ اشعار بھی ملتے ہیں۔ اگر غزل میں دوسرا مطلع بھی ہو تو اسے "حسنِ مطلع" یا "زیبِ مطلع" کہتے ہیں۔ غزل کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے، اس شعر کو "مقطع" کہتے ہیں۔ غزل کے سب سے حسین شعر کو "شاہ بیت" یا "بیت الغزل" کہتے ہیں۔ غزل کے ہر شعر کا معنی جداگانہ ہوتا ہے۔

NOTES

کچھ غزلوں میں موضوع کی وحدت پائی جاتی ہے اور شاعر تسلسل کے ساتھ ایک ہی موضوع کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرکے بیان کرتا ہے۔ اس طرح کی غزل کو "غزلِ مسلسل" کہتے ہیں۔ جس غزل میں ردیف نہ ہو صرف قافیے ہوں اس طرح کی غزل کو "غیر مردف" کہتے ہیں۔ وہ بحر اور ردیف جس کے لحاظ سے غزل کہی جاتی ہے اسے غزل کی "زمین" کہتے ہیں۔

اردو ادب میں، خواجہ میر درد، میر تقی میر، مومن، غالب، اقبال، حسرت موہانی، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی مشہور غزل گو شاعر ہیں۔

Notes

Date

"نظم"

نظم کے لغوی معنی "موتی پرونا" "آراستہ کرنا" ہیں۔ نظم کے معنی "انتظام" "ترتیب" یا "آرائش" کے بھی ہیں۔ یوں تو ہر موزوں کلام کو نظم کہا جاسکتا ہے۔ لیکن عام اصطلاح میں نظم سے مراد وہ شعری اصناف اور اسالیب ہیں جس میں کسی موضوع پر ربط و تسلسل کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہو۔ نظم شاعری کی وہ شکل ہے جس میں کوئی قصہ، کوئی واقعہ، کوئی تجربہ یا کوئی خیال تسلسل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ کیونکہ نظم کے معنی ہی پرونے اور یکجا کرنے کے ہیں۔ غزل کے علاوہ شاعری کی بیشتر اصناف مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ اور رباعی وغیرہ نظم کے دائرے میں آتی ہیں۔ نظم کی دیگر تمام قسموں اور صنفوں کے علاوہ خود نظم بھی ایک صنف شاعری ہے۔ جو نظم کی مروجہ قسموں پر ہی لکھی جاتی ہیں۔ مگر اس میں اشعار یا بندوں کی کوئی قید روا رکھی نہیں جاتی۔ نظم کسی خاص موضوع پر ہوتی ہے خواہ وہ موضوع کچھ بھی ہو۔ نظم کا میدان غزل سے زیادہ وسیع ہے۔ نظم کسی ایک عنوان یا موضوع کی تفصیل ہوتی ہے۔ غزل کے جذبات لامحدود ہوتے ہوئے بھی محدود ہوتے ہیں۔ اور ایک شعر میں کوئی ایک ہی جذبہ نظم کیا جاسکتا ہے۔ مگر نظم میں ایک موضوع کی اتنی وضاحت ہوتی ہے کہ شاعر اور سامع دونوں سیر ہو جاتے ہیں اور موضوع بھی تشنہ نہیں رہتا ہے۔ غزل کے اشعار اگر شبنم کے حسین قطرات ہیں تو نظم زمین کو سیراب اور دل دہقاں کو شاداب اور فرحاں کر دینے والی موسلا دھار بارش ہے۔ نظم کی کوئی مقررہ شکل یا ہیئت نہیں ہوتی۔ نظم کے لئے بہر حال ضروری ہے کہ خیال یا معنی کے اعتبار سے اس میں تسلسل ہو اور ایک شعر دوسرے شعر سے پیوست ہوتا چلا جائے۔ نظم کی ابتدا بچوں کی معصوم صورت اور پیاری صورت کی طرح نہایت دلکش اور حسین ہوتی ہے۔ اس کا عروج اپنے اندر شباب کا جوش رکھتا ہے اور انجام و اختتام کی حسن کاری بھی قابل توجہ اور نتیجہ خیز ہوتی ہے اور پھر سارے عشوے (معشوقانہ ادا، نخرہ) ساری ادائیں اطوارے جلوے ایک حسن کا تصور پیش کرتے ہیں۔ کثرت میں یہی وحدت نظم کو کامیاب بناتی ہے۔

اردو شاعری میں اگرچہ نظیر اکبر آبادی نے نظم نگاری کی ابتدا کی مگر صحیح معنوں میں اس کی ترقی آزاد، حالی، اسمٰعیل اور درگا سہائے سرور کے ہاتھوں ہوئی۔ اور اسے علامہ اقبال نے اوج کمال تک پہنچایا۔ موضوع، مصرعوں اور بندوں کی ترتیب کے اعتبار سے دور قدیم میں نظم کا کچھ خاص اسالیب کا رواج رہا ہے۔ مثال کے طور پر مسدس، مخمس، ترجیع بند وغیرہ۔ ان قدیم اصناف اور اسالیب نظم کے فنی آداب اور اصول اتنے سخت تھے کہ ان میں کسی شاعر کو اصلاح و ترمیم کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ وہ ان ہی روایات اور ضابطوں کے پابند رہتے تھے۔ لیکن جب زمانے اور زندگی نے کروٹ بدلی۔ ملک میں نئے حالات اور نئے مسائل پیدا ہوئے۔ سیاسی، سماجی اور تہذیبی میدان میں تبدیلیاں رونما ہوئی تو اردو نظم کے روایتی اسالیب میں بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی اور اس طرح نظم جدید کا آغاز ہوا۔

Scanned with CamScanner

مولانا الطاف حسین حالی

حالاتِ زندگی:-

الطاف حسین نام اور حالی تخلص تھا۔ ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے۔ نو سال کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا جن کا نام ایزد بخش تھا۔ پرورش بڑے بھائی نے کی۔ چھوٹی عمر میں ہی شادی ہوگئی۔ عربی اور فارسی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ملازمت کی غرض سے دہلی آئے۔ ~~۱۸۵۵ء کے بعد~~ دہلی میں ہی ان کی ملاقات غالب سے ہوئی اور غالب سے اصلاح لینی شروع کی۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ سے ملاقات کے بعد ان کے لڑکوں کے اتالیق مقرر ہوئے۔ غالب اور شیفتہ کے انتقال کے بعد لاہور گئے وہاں گورنمنٹ بک ڈپو میں درسی کتابوں کی عبارت درست کرنے پر مامور ہوئے۔ اسی زمانے میں سر سید احمد خان سے ملاقات ہوگئی اور سر سید تحریک میں دل و جان سے شریک رہے۔ بالآخر زندگی کا آخری حصہ پانی پت میں گزارا اور یہیں پر ۱۹۱۴ء میں انتقال فرمایا۔

شاعرانہ خصوصیات:-

شاعری کی حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کو نئی راہوں پر ڈالا اور غزل اور قصیدے کی خامیوں کو واضح کیا۔ حالی کی شاعری کا مقصد قومی اصلاح تھا۔ اسلئے انہوں نے اپنی شاعری میں سادہ اور آسان الفاظ کا استعمال کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں عاشقانہ جذبات کو نہایت پر اثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ حسن و عشق کے رموز بڑی سادگی اور لطیف انداز میں ظاہر کرتے ہیں۔ آپ نے اردو شاعری کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے غزلوں کے ~~عہد~~ مقابلے میں آپ کی نظمیں زیادہ مقبول ہوئی۔ ان کی نظموں میں سادگی، روانی، یک رنگی اور تسلسل موجود ہے۔ ان کے کلام میں سادگی، دردمندی اور جذبات کی پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ ان کی چار اہم کتابیں "حیاتِ سعدی"، "مقدمہ شعر و شاعری"، "یادگارِ غالب" اور سر سید کی سوانح "حیاتِ جاوید"، خاصی اہمیت رکھتی ہیں۔

حالی نے ایک طویل نظم مسدس کی ہیئت میں "مد و جزرِ اسلام" لکھی جس کے بارے میں سر سید نے کہا کہ "قیامت کے دن جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا ہے تو میں کہوں گا حالی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں"

NOTES

"نظم"

خلاصہ :- تعلیم سے بے توجہی کا نتیجہ

یہ نظم "تعلیم سے بے توجہی کا نتیجہ" الطاف حسین حالی کی لکھی ہوئی نظم ہے۔ حالی اس نظم میں تعلیم کی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دنیا میں جن لوگوں نے تعلیم کی قدر و قیمت نہیں کی وہ لوگ اندھیروں میں ڈوب گئے ہیں اگر بادشاہ تھے تو ان کی حکومتیں ختم ہو گئی۔ علم سے دوری اختیار کرنے کی وجہ سے مالدار مفلسی میں مبتلا ہو گئے، خاندانوں کی عزت مٹ گئی اور شرافت نے اپنا وقار کھو دیا ہے۔ کاریگروں کے کام اور پیشہ وروں کے کام میں کمی آ گئی۔ گھروں میں تعلیم سے دوری کی وجہ سے تالے پڑ گئے اور دولت کمانے والے لوگ بے کار ہو گئے ہیں۔ ہنرمند اور فن کاروں کی تعداد بھی کم ہوتی گئی۔ ادیب بھی علم کی بے توجہی کی وجہ سے کوئی مفید ادب تخلیق نہیں کر سکتے۔ حکیم، فلاسفر، مناظر، اور ناظم بھی دن بہ دن کم ہوتے جا رہے ہیں۔ تعلیم سے بے توجہی برتنے کی وجہ سے نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے کاریگروں کو ایک ٹوپی بنانے کے لئے کپڑا اور سوئی وغیرہ دوسرے ممالک سے منگوانے پڑتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں بھی یہاں کے لوگ بہت پیچھے ہیں۔ اگر مغربی ممالک سے تجارت کا مال نہ آتا تو یہاں کے تجارت پسند لوگ بھوکے مر جائیں گے۔ اور ان کے ساتھ وابستہ لوگوں کے لئے معاشی اور اقتصادی راستے بند ہو جائیں گے اور دکانوں میں کوئی بھی چیز دیکھنے کو نہیں ملیں گے۔ بڑے بڑے تاجر دوسروں کے بل بوتے پر اپنا کام چلاتے ہیں ان کی بھی کوئی بنیاد نہیں ہو گی۔ یہ ساری مشکلات اور کوتاہیاں تعلیم سے دوری اختیار کرنے کی وجہ ہے۔ حالی فرماتے ہیں کہ یہ سب اگر اپنی اس غفلت سے باز نہ آئیں گے ورنہ ان پر بہت ساری مصیبتیں نازل ہو جائیگی۔ یعنی ان کے لئے آنے والا وقت بہت ہی کٹھن ہو گا۔ وقت کی ایسی ہوا آنے والی ہے جو سارے چراغوں کو بجھائے گی۔ صرف وہی چراغ محفوظ رہیں گے جو تعلیم کے زیور سے روشن ہوئے ہونگے۔ نئے زمانے کا فوجی کھڑے کھڑے ہر اک فوجی کا جائزہ لے رہا ہے کہ کون زمانے کے ساتھ چلنے والا ہے اور کون رکنے والا ہے۔ جن میں ہوشیاری اور بہادری دیکھتا ہے ان کو زندگی کے ساز و سامان کے زیور سے نوازتا ہے اور جو بے ہنر ہے ان کا نام فہرست سے مٹایا جاتا ہے۔ شاعر ہندوستانی قوم کو جھنجھوڑتا ہے کہ وہ غفلت کی نیند سے بیدار ہو جائیں اور جدید تعلیم سے اپنے آپ کو آراستہ کریں اور دنیا کی دوسری ترقی یافتہ قوموں کی صفوں میں کھڑا ہو جائیں۔

NOTES

اکبر الہ آبادی

حالاتِ زندگی:—

آپ کا اصلی نام سید اکبر حسین رضوی تھا اور تخلص اکبرؔ اختیار کیا۔ ۱۸۴۶ء میں الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام سید تفضل حسین تھا۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ مزید تعلیم مکتب اور اس کے بعد جمنا مشن اسکول سے حاصل کی۔ ملازمت کی ابتدا عرضی نویسی سے کی۔ ۱۸۶۶ء میں مختاری کا امتحان پاس کر کے نائب تحصیلدار ہو گئے۔ ترقی کرتے کرتے منصف کے عہدے پر مامور ہوئے۔ ۱۸۹۴ء میں سیشن جج ہو گئے۔ آنکھوں کی بیماری کی وجہ سے قبل از وقت پنشن لے لی۔ ان کی زندگی کا آخری زمانہ ذہنی و جسمانی تکالیف اور پریشانیوں میں گزرا۔ بیوی اور چھوٹے بیٹے کی موت سے دل پر گہری چوٹ پہنچی۔ بالآخر ۱۹۲۱ء کو ۷۵ پچھتر برس کی عمر میں انتقال کیا۔

شاعرانہ خصوصیات:—

اکبر کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ انہوں نے زمانے کے مزاج کے مطابق شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ ابتدا میں خواجہ حیدر علی آتش سے اصلاح لی۔ پھر اپنا الگ رنگ پیدا کیا۔ مغرب زدہ طبقے کو طنز و مزاح کی چٹکیاں لے کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتے تھے۔ انہوں نے طنز و مزاح کے ذریعے انگریزی تعلیم کے منفی اثرات اور مغربی تہذیب کی اندھی تقلید پر بھرپور وار کیے اور چھوٹی چھوٹی نظموں سے وہ کام لیا جو بڑی بڑی تقریروں سے نہ لیا جا سکتا تھا۔ اکبر نے اپنے دور کے معاشرت اور تہذیب کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے اور اس کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ اکبر اپنی شاعری کی مدد سے قوم کی اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ انہیں قوم کی لٹتی ہوئی تہذیب کا بڑا احساس تھا۔ تعلیم نسواں، بے پردگی اور انگریز مغرب کی اندھی تقلید ان کے کلام کے خاص موضوعات ہیں۔
اکبر کا کلام "کلیاتِ اکبر" کے نام سے تین حصوں میں شائع ہو چکا ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

نظم

"نئی تہذیب"

خلاصہ:-

"نئی تہذیب" یا "مستقبل" اکبرالہ آبادی کی لکھی ہوئی نظم ہے۔ اکبر نے یہ نظم تقریباً ایک صدی پہلے لکھی ہے جب انگریزی دورِ حکومت عروج پر تھی۔ اکبر اپنی تہذیب و تمدّن پر مغربی اثرات پڑتے دیکھ پیشن گوئی کرتے ہیں کہ ہو جو وہ طریقے ختم ہو جائیں گے اور نئی تہذیب اور نئے طور طریقے فراہم ہونگے۔ حسینائیں نئے نئے طریقوں سے اپنے حسن کا اظہار کریں گی۔ خواتین پردے کی پابندی چھوڑ دیں گی اور اپنے چہرے کھلے رکھیں گی۔ زمانے کی گردش سے لوگوں کی طبیعت کے انداز بھی بدل جائیں گے۔ زمانہ بدلنے کے ساتھ ساتھ نئی نئی خوشیاں ہونگی اور پریشانیوں کے اسباب بھی نئے نئے ہونگے۔ یورپ کی پیروی کر کے نغمہ گانے والے بہت ہونگے لیکن ان میں کوئی اتفاق نہیں ہوگا اسلئے کہ وہ بے تال اور بے سُر ہونگے جس کی وجہ سے ان کی باتوں میں کوئی تاثیر نہیں ہوگی۔ زبان کا معیار بھی بدل جائے گا۔ جو اصطلاحیں آج ہماری زبان میں استعمال ہوتی ہیں ان سے نئی ناواقف ہوگی اور انگریزی زبان کے الفاظ اُردو میں شامل ہو جائیں گے اور ہماری زبان بازاری زبان بن کے رہ جائے گی۔ لیکن بدنصیبی کی بات تو یہ ہے کہ اس تبدیلی کو دیکھ کر بھی کسی انسان کو نہ احساس ہوگا اور نہ کوئی غم ہوگا۔ لوگ جس ماحول میں پیدا ہوئے ہونگے اسی ماحول کو بہتر سمجھیں گے۔ شاعر اکبرالہ آبادی مایوسی کی حالت میں اپنے آپ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ اے اکبرا! تم اس تہذیب و تمدّن کے بدلاؤ اور زوال پر غم زدہ اور پریشان کیوں ہو رہے ہو۔ کیونکہ تم اس زوال پذیر وقت تک اس دنیا میں نہیں رہوگے وہ دن بہت قریب ہے جب تم اس دنیا سے چلے جاؤگے۔

اکبرالہ آبادی نے اس نظم میں جو پیشن گوئیاں کی آج سے پہلے سو سال کی ہے وہ تقریباً آج ساری صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ اور آج قاری جب یہ نظم پڑھتا ہے تو اکبرالہ آبادی کو دل سے داد دیتا ہے۔ اس نظم کی زبان نہایت آسان، عام فہم اور سادہ ہے۔ طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ شاعر کے قومی ہمدردی کے جذبات بھی نظم میں نمایاں طور پر ملتے ہیں۔

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar M.A B.Ed 7889726757

Sunday 18
NOTES

Scanned with CamScanner

ڈاکٹر سر محمد اقبال

حالاتِ زندگی:-

محمد اقبال نام اور اقبال تخلص تھا۔ ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ نور محمد اور والدہ کا نام امام بی بی تھا۔ اقبال کے آباواجداد کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں جا بسے۔ اقبال کو اپنے کشمیری نژاد ہونے پر فخر تھا۔ ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی بعد میں سکاچ مشن اسکول میں داخلہ کیا گیا۔ جہاں انہیں سید میر حسن سے عربی اور فارسی پڑھنے کا موقع ملا۔ اقبال نے میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات یہیں سے پاس کئے۔ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا جہاں سے انہوں نے بی، اے اور بعد میں فلسفہ میں ایم کیا۔ میونخ یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی اور لندن سے بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔ لاہور میں اورینٹل کالج میں استاد کی حیثیت سے کچھ دیر کام کرنے کے بعد وکالت کے پیشے کو اپنایا۔ اقبال کا شمار دنیا کے بڑے عالموں اور مفکروں میں ہوتا ہے اور علامہ بھی کہلاتے ہیں۔ آپ کے استاد داغ دہلوی تھے لیکن آپ نے غالب کی پیروی کی۔ اقبال کی عالمگیر مقبولیت اور علمی مرتبہ سے متاثر ہو کر حکومت برطانیہ نے آپ کو "سر" کا خطاب دیا۔ اقبال نے طویل علالت کے بعد ۱۹۳۸ء میں لاہور میں انتقال کیا اور شاہی مسجد لاہور کے احاطے میں دفن ہوئے۔

شاعرانہ خصوصیات:-

اقبال اردو اور فارسی کے مشہور اور اعلیٰ پایہ کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے قلم سے جذبات و احساسات کے موتیوں کو حروف کی مالا میں پروتے۔ ان کے پُرجوش قلم سے ان کے دل کی پکار سنائی دیتی ہے۔ انہوں نے کلام کے عکس میں اِس امت کو ایک پاکیزہ نسل عطا کی۔ اس دنیا کے شاہینوں کو اڑان اور پرواز سکھائی، نوجوانوں کو بلندیوں سے ہمکنار کرایا۔ ایک قوم کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرایا اور ان افراد کو خودی سے نوازا جو اپنے ہی کاندھوں پر اپنی ہی لاشوں کو اٹھائے استحکام سے عاری سماج میں گردش کر رہے تھے۔ انہوں نے نثر میں بھی چند کتابیں لکھی مگر ان کی شہرت کا باعث ان کی شاعری ہے۔ اردو میں ان کے شعری مجموعوں میں بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، ارمغانِ حجاز قابلِ ذکر ہیں۔ کشمیر اور کشمیر کے لوگوں سے انہیں بے حد محبت تھی جس کا اظہار ان کی اردو اور فارسی کی کئی نظموں سے ہوتا ہے۔ ان میں ساقی نامہ، کشمیری ملازادہ ضیغم لولابی کی بیاض وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

Scanned with CamScanner

"بزمِ انجم"

خلاصہ:-

9 نظم "بزمِ انجم" علامہ اقبال کی لکھی ہوئی نظم ہے۔ اقبال نے اس نظم میں شام ہونے اور شام کے بعد رات کے پر پھیلانے اور آسمان میں تاروں کے چمکنے اور ان کا انسان سے مخاطب ہو کر امن کا پیغام دینے کے نقشہ نہایت دلکش انداز میں کھینچا ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ جب سورج غروب ہوتا ہے تو اندھیرا ہونے سے پہلے شفق کی سرخی اس طرح ظاہر ہوتی ہیں جیسے دلہن نے دن میں پہنے ہوئے چاندی کے زیور اتار کر سونے کے زیور پہنے ہوئے ہیں۔ خاموش اندھیری رات دلہن ~~جیسے~~ کی طرح اونٹ کے کجاوے پر اپنے دامن میں پیارے پیارے موتی لے کر آئی ہے۔ یہ موتی انسان کی ہنگامہ خیز دنیا سے بہت دور ہیں جن کو انسان تاروں کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ یہ تارے آسمان کو روشن کرتے اور سجانے میں مشغول ~~ہیں~~ ہوتے ~~ہوئے~~ ہیں تو اچانک آسمانِ بالا سے ایک فرشتے نے آواز دی۔ وہ فرشتہ تاروں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ اے آسمان پر رات کو پہرہ دینے والو! تمہاری قوم خوش حال ~~ہے~~ اور روشن ہے۔ اب تم ایسا نغمہ اور گیت گاؤ کہ دنیا میں غفلت میں پڑے لوگ بیدار ہو جائیں کیونکہ بھٹکنے والے قافلوں کی رہبری کرنا ہی تمہارا کام ہے۔ تم زمین کے لوگوں کو آواز دو شاید تمہاری آواز کا ان پر کچھ اثر ہو کیونکہ وہ اپنی قسمت کو تمہارے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ فرشتے کی آواز سارے آسمان میں گونجی اور تاروں بھرے آسمان کی اس محفل میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ جس طرح شبنم کے قطروں میں آئینہ کی طرح پھولوں کا عکس دکھائی دیتا ہے اسی طرح تاروں کی خوبصورتی میں قدرت کا حسن نمایاں ہے۔ جو قوم اپنے پرانے طریقوں اور رواجوں پر رہ کر وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر رہتی ہے ان کی زندگی نہایت مشکل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ زندگی کا قافلہ تیز رفتاری سے دوڑ رہا ہے اور اس ~~تیز~~ دوڑ میں بہت سی قومیں کچلی جا چکی ہے۔ تاروں کے اس جھرمٹ میں بہت سے تارے ایسے بھی ہیں جو ہماری آنکھوں سے اوجل ہے۔ تاروں کے اس نظام میں دنیا کے لوگوں کے لئے نہایت ہی اہم سبق اور نصیحت پوشیدہ ہے کہ باہمی اتحاد و اتفاق سے ہی ساری کائنات کا نظام اور امن قائم و دائم ہے۔ لیکن انسان اپنی ساری عمر میں یہ بات نہیں سمجھ سکا۔ کیونکہ وہ قدرت کے بنائے ہوئے نظام کے اسرار و رموز پر غور نہیں کرتا۔ شاعر فرماتے ہیں کہ ہم نے تھوڑی ہی غور و فکر کی تو ہم پر قدرتی نظام کی ساری پوشیدہ حقیقتیں ظاہر ہو گئے۔

NOTES

چکبست

حالاتِ زندگی:۔

پنڈت برج نرائن چکبست نام اور تخلص چکبست تھا۔ ۱۸۸۲ء میں فیض آباد میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام اودت نرائن چکبست تھا۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں حاصل کی۔ اور یہاں کے ایک مقامی گورنمنٹ کالج سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ وکالت کا امتحان پاس کرنے بعد وکیل ہو گئے۔ وکالت اور دوسرے سلسلوں میں لکھنؤ آنا جانا لگا رہتا تھا پھر بعد میں وہیں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۲۶ء میں ایک مقدمے کی پیروی کے سلسلے میں رائے بریلی آئے واپس لوٹنے کے لئے ریلوے اسٹیشن تک آئے تھے۔ فالج کا شکار ہو کر اس دنیا کو خیر باد کہہ کر چلے گئے۔

شاعرانہ خصوصیات:۔

چکبست نے اپنی پہلی غزل نو یا دس سال کی عمر میں کہی۔ اور جلد ہی ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے معیاری شاعری کرنے لگے۔ آپ کا ذہنی میلان ابتدا ہی سے شاعری کی طرف تھا۔ آپ شعر کے رموز و نکات پر گہری نظر تھی۔ آپ کے کلام پر غالب اور انیس کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ زبان و بیان پر آتش کا اثر ہے۔ چکبست حقیقت میں قومی شاعر تھے۔ وطن کے نوجوانوں کو وطن کی محبت اور اس کی ترقی کی طرف متوجہ کرنا ان کا اصل مقصد تھا۔ بہر حال اپنے کلام میں انہوں نے اس زمانے کے سیاسی حالات کو بڑی خوبی اور کامیابی سے پیش کیا۔ میر انیس کے اسلوبِ شاعری سے وہ سب سے زیادہ متاثر تھے۔ مسدس رامائن کا ایک سین پڑھتے وقت انیس کا زورِ بیان اور جذباتِ انسانی کی ترجمانی یاد آجاتی ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

"کشمیر"

خلاصہ :-

یہ نظم "کشمیر" چکبست کی لکھی ہوئی نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر کشمیر کی خوبصورتی کا تذکرہ ایک دلفریب انداز میں کرتے ہیں۔ شاعر کشمیر کی صبح کا خوشنما منظر پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ کشمیر میں صبح کا بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ جب صبح کے وقت پھول پہاڑوں پر اپنی خوشبو پھیلاتے ہیں اور ان پہاڑوں کی جھاڑیوں میں چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ آسمان کی سرخی اور پہاڑ سرخ گلابوں سے مہک اٹھتے ہیں۔ ابر کے ٹکڑے مستی اور مدہوشی میں جھومتے ہیں اور جب خوشگوار صبح کی یہ تازہ ہوا پھولوں کو ہلاتی ہے تو کشمیر کی اس خوبصورت دھرتی پر پریوں کے ناز و انداز سے چلنے کا گمان ہوتا ہے۔ پہاڑوں پر رہنے والے پرندے، پہاڑوں کے دامن سے نکل کر بہنے والے چشمے، سرد ہوا کے جھونکے، بادلوں سے موتی کی طرح قطروں کا برسنا، خوبصورت اور سرسبز پھلوں اور پھولوں کے باغوں کو دیکھ کر صدیوں کا پڑا ہوا بیمار تندرست ہو جائے گا۔ کشمیر کی خوبصورتی کا عالم تو یہ ہے کہ یہاں کے باغات جنت کے باغوں تک کو شرمندہ کرتے ہیں۔ دنیا کو سجانے والی ہستی یعنی اللہ تعالیٰ کو بھی اس باغ کی خوبصورتی پر فخر اور ناز ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ اگرچہ مجھے اس وادیٔ گلزار کو چھوڑے ہوئے ایک زمانہ بھی گزرا ہے لیکن وہاں کی محبوب یادیں ابھی بھی میرے دل میں بسی ہوئی ہیں۔ کشمیر کی مٹی نے ان دانشوروں اور عالموں کو جنم دیا ہے جن کی عظمت اور بزرگی کا ساری دنیا اعتراف کرتی ہے اور ان ہی بزرگوں کا خون میری رگوں میں گردش کرتا ہے جو کشمیر کی اس پاک سرزمین میں مدفون ہوئے ہیں۔

شہ زور کاشمیری

حالاتِ زندگی :-

غلام قادر نام اور شہ زور کاشمیری کے تلمی نام سے جانے جاتے ہیں ۔ ۱۹۱۵ء کو چھوٹہ بازار سرینگر میں پیدا ہوئے ۔ والد کا نام غلام محمد خان تھا ۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مشن ہائی اسکول میں داخلہ لیا ۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایس، پی کالج سے بی ، اے کیا ۔ اس کے بعد محکمہ تواضع (INCOME TAX) میں کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوئے ۔ ترقی کرتے کرتے فائننشل ایڈوائزر کے عہدے پر فائز ہوئے ۔ ۱۹۹۵ء کو سرینگر میں انتقال کیا ۔

شاعرانہ خصوصیات :-

شہ زور کاشمیری کو ابتدائی عمر سے ہی شعر و شاعری سے لگاؤ تھا ۔ ان کے والد خود بھی شاعر تھے اور شہ زور کی شاعرانہ صلاحیتوں سے واقف تھے ۔ وہ شہ زور کو "شعر پروردہ" کہہ کر پکارتے تھے ۔ طالبِ علمی کے زمانے میں ہی ان کا کلام کالج کے میگزین " پرتاپ " میں چھپتا رہا ۔ ۱۹۳۸ء میں علامہ سیماب اکبرآبادی کے شاگردوں میں شامل ہوئے ۔ ان کی پہلی نظم ماہنامہ شاعر ممبئی میں شائع ہوئی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شہرت وادی کی حدود سے نکل کر برصغیر کے ادبی حلقوں تک پہنچ گئی ۔ اُردو نظم نگاری ان کا خاص میدان ہے ۔ نظم نگاری کے ساتھ ساتھ وہ غزل، قطعہ، رباعی وغیرہ بھی کہتے تھے ۔ شہ زور اقبال کی فکر اور لب و لہجے سے بہت متاثر تھے ۔ سید سلیمان ندوی نے انہیں "کشمیر کا اقبال" کہا ہے ۔ شہ زور کی شاعری کی نمایاں خصوصیات رومانیات، فطرت پسندی، جذبۂ آزادی اور تلاشِ حسن ہے ۔ وادی کشمیر کے فطری حسن کا ذکر ان کی شاعری میں جابجا ملتا ہے ۔ "صبح شالیمار" "نمائش گاہ" "آزادی کی دستک" اور امیراکدل "پری محل" جیسی نظمیں کشمیر کے حسن و جمال اور حسنِ فطرت کے شاہکاروں کی عمدہ مثالیں ہیں ۔

Scanned with CamScanner

خلاصہ:- "پری محل"

یہ نظم "پری محل" شہ زور کاشمیری کی لکھی ہوئی نظم ہے۔ شاعر نے یہ نظم کشمیر کی یاد میں لکھی ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ مجھے کشمیر کا وہ موسم بہار یاد ہے جب پانی کی ندیوں کا ناچ و نغمہ دیوانہ بنا دیتا تھا۔ اور جب مست بادل سارے عالم کو نئی نویلی دلہن کی سجانے میں مشغول رہتے تھے۔ جب رنگ برنگے پھول قہقہوں کی طرح کھل اٹھتے تھے اور ہر سمت بلبلوں کی چہچہاہٹ زندگی کو منور کرتی تھی۔ پہاڑوں کا دامن خدا کے نور کا آئینہ نظر آرہا تھا۔ جس کو دیکھ کر جھیل ڈل کے خوبصورت کنول چمک رہے تھے۔ اس خوبصورت منظرے دار بہار کو دیکھنے کی چاہت مجھے پری محل لے گئی۔ اگرچہ عیش و عشرت کا کافی سامان وہاں پر موجود تھا۔ لیکن پری محل کے دروازوں کے پردے اس نظارے کو دیکھنے میں رکاوٹ پیدا کرتے تھے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ تین سو سال پرانے اس محل کو دیکھنے کی چاہت میں میں نے بھاری تاریکی پردے کو ڈرتے ڈرتے سرکایا اور میں اس زمانے میں چلا گیا۔ جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ لیکن میرا یہ تجسس ایک رنگین روشنی پھیلانے والے سورج کی طرح چمکا اور میں نے وہاں پُر وقار منظر اور شان و شوکت دیکھی اور پردے کے پیچھے ایک شاہی محل تھا جہاں دربار لگا ہوا تھا۔ شاعر فرماتے ہیں کہ سبز رنگ کی چادر اوڑھے ہوئے اس پہاڑی پر یہ روشن اور سنہرا محل ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوہ طور کا نور اس بنا سنگھار کر رہا تھا۔ سبز جھاڑیوں میں بیٹھی خوبصورتی تیتری ایسی لگ رہی تھی جیسے قیمتی پتھروں اور موتیوں کے بیچ ایک پری ناچ رہی ہو۔ اور محل ایسا لگ رہا تھا جیسے چاند آسمان سے اتر کر زمین کے حسین اور خوبصورت ماتھے پر مہر لگا چکا ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ اس محل کا ماحول اور نظارہ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے یہاں بادلوں سے پاکیزہ پانی چھلکتا ہے۔ یہاں پھول کھلتے ہیں اور بلبل چہکتے ہیں۔ ہوا کے ملائم اور خوشگوار جھونکے خوشبو پھیلاتے ہیں اور فرشتے [illegible] سرور میں آکر جھومتے ہیں۔ حیرانگی کے عالم میں شاعر فرماتے ہیں کہ کیا یہ شاعر کے ذہن کی بلند خیالی کی تصویر ہے یا خوبصورت پریوں کے دلفریب خوابوں کی تشریح ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ اس پھولوں بھرے اس چمن کی شام بھی انتہائی قابل تعریف ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جنت کی خوشبودار گھاس میں سے کوئی سرخ گلاب کھلا ہوا ہے۔ صبح کی رنگینی جس آب و تاب سے نمودار ہوتی ہے ایسا لگتا ہے کہ جنت کی کسی جوان اور حسین و جمیل لڑکی کی جوانی جوش مار رہی ہے۔ یہاں ہر قدم پر رنگ اور خوشبو کا انتظام ہے اور ہرے پودوں کے ہاتھوں میں خوشبودار اور رنگین جام ہے۔

Scanned with CamScanner

اخترالایمان

حالاتِ زندگی :-

اخترالایمان ۱۹۱۵ء میں ضلع بجنور کے نجیب آباد شہر میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد دہلی کے فتح پوری مسلم ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔ اس کے بعد دہلی یونیورسٹی سے بی۔اے کیا۔ گھر کے مالی حالات بہت خراب تھے جس کی وجہ سے انہیں ایک عرصے تک دہلی کے یتیم خانہ میں رہنا پڑا۔ یہ زمانہ ان کی زندگی کا سب سے تکالیف دہ زمانہ تھا۔ لیکن بعد کی زندگی انہوں نے پرسکون گزاری۔ پہلے محکمہ سول سپلائی میں کام کیا۔ پھر کچھ مدت تک آل انڈیا ریڈیو میں رہے۔ اس کے بعد ممبئی چلے گئے اور فلموں کی کہانیاں لکھنے لگے۔ بالآخر ۱۹۹۶ء میں انتقال کیا۔

شاعرانہ خصوصیات :-

اخترالایمان نے شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے کی۔ لیکن بعد میں نظموں کی طرف مائل ہو گئے۔ اردو نظم کے ارتقا میں انہوں نے اہم رول ادا کیا۔ ان کی شاعری میں جذبات کا رنگ ابھرتا ہے جس سے ان کی نظمیں قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ وہ ایک علامتی شاعر تھے اس لئے ان کی نظمیں غور و فکر کا مطالبہ کرتی ہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی نظموں میں شدتِ احساس پوری طرح جلوہ گر ہے۔ ان کی نظموں میں انسانی رشتوں کی دھوپ چھاؤں اور نیکی اور بدی کی کشمکش جیسے موضوعات خصوصیت کے ساتھ ابھرتے ہیں۔ "یادیں" اور "بنتِ لمحات" ان کے دو شعری مجموعے ہیں۔ "ایک لڑکا" ان کی مقبول ترین نظم ہے۔ ان کا کلیات "سروسامان" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ ان کی نظموں کے دیگر مجموعے جن میں "گرداب، تاریک سیارہ، آب جو، نیا آہنگ، منظوم تمثیل اور سب رنگ" وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔

Scanned with CamScanner

خُلاصہ:-

"قبر"

یہ نظم "قبر" اختر الایمان کی لکھی ہوئی نظم ہے۔ شاعر نے اس نظم میں ایران کے ایک رئیس کی موت کا قصہ بیان کیا ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ یہ ایران کے ایک شہر کی کہانی ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ دنیا میں آنے جانے یعنی موت و حیات کا جو سلسلہ ہے یہ ازل سے قائم و دائم ہے۔ اس کے بھنور یعنی زد میں آکر ہر چیز ڈوب جاتی ہے۔ اس ایران کے شہر کے ایک قصبے میں کوئی بڑا رئیس موت کے اس جال میں اس طرح پھنسا کہ کوئی بھی ترکیب فائدہ مند ثابت نہ ہوئی ہر ایک حکیم سے مدد لی اور ہر قسم کی دوا آزمائی جس سے اس کا علاج ممکن تھا۔ اور اس نے وہ ہر کوشش کی جو اس کے قبضۂ اختیار میں تھی۔ دور و نزدیک جو بھی چھوٹا بڑا کوئی حکیم تھا ان سب کو بلا کر ان کو بے شمار دولت دی گئی تاکہ اس کی صحت میں افاقہ آجائے لیکن جو خدا کو منظور تھا آخر وہی ہوا اور موت نے بیٹے سے اس کے پیارے باپ کو جُدا کیا۔ اس امیر شخص کے مرنے کی خبر ایک لمحے میں دور و نزدیک ہر جگہ پھیل گئی جو بھی اس خبر کو سنتا تھا وہ زار و قطار روتا تھا۔ اور اس کا بیٹا سینہ پیٹ پیٹ کر اپنے باپ کو پکارتا تھا۔ اس ماتم کا سب لوگوں کے دلوں پر بہت اثر ہو رہا تھا۔ بیٹا اپنے باپ کو پکار کر کہہ رہا تھا کہ ہمیں چھوڑ کر تم ایسی جگہ چلے گئے جہاں نہ کوئی دوست، نہ کوئی ساتھی، نہ کوئی ہمدرد اور مددگار ہوگا۔ تم کو ایک ایسے چھوٹے اور اندھیرے گھر کمرے میں رہنا پڑے گا جہاں نہ کھانا نہ پانی ہوگا، اور وہاں کی ہر تکلیف تمہیں خود ہی برداشت کرتے پڑے گی۔ وہاں جو بھی حالات ہونگے ان کو تمہیں خود ہی سہنا ہوگا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ وہاں آپ کو ہر چیز کے لئے ترسنا پڑے گا۔ کیونکہ وہ ایک ایسی دنیا ہے جہاں کوئی بھی تمہاری مدد کے لئے نہیں آئے گا۔

اس امیر کے جنازے میں ایک غریب آدمی بھی اپنے بیٹے کے ساتھ شامل ہوا تھا۔ جب غریب آدمی کے بیٹے نے رئیس آدمی کے بیٹے کی آہ و بکا اور رونا سنا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو وہ بڑی معصومیت سے اپنے باپ سے مخاطب ہوا اور بولا کہ کیا اس کے باپ کو ہمارے گھر لیا جا رہا ہے۔

گویا غریب شخص کے بیٹے کو قبر کی یہ کھینچی ہوئی تصویر اپنے گھر جیسی لگتی ہے جہاں کسی قسم کی بھی کوئی سہولیت اور آرام میسر نہیں تھا۔

NOTES

Scanned with CamScanner

سوالات "حصۂ نظم"

سوالات: نظم "تعلیم سے بے توجہی کا نتیجہ" (حالی)

سوال 1:- تعلیم کی قدر و قیمت کیا ہے؟

جواب:- تعلیم ایک ایسی دولت ہے جو کبھی کم نہیں ہوتی۔ تعلیم سے انسان زندگی کاموں میں کامیابی اور کامرانی کے راستے ہموار کرتا ہے۔ تعلیم کے بغیر ایک انسان کی وبال ہے۔ تعلیم سے ہی انسان کھرے اور کھوٹے، اچھے اور برے میں فرق کر سکتا ہے۔ تعلیم سے ہی ہر ملک اور قوم، ہر فرد اور جماعت خوشحالی اور ترقی پا سکتے ہیں۔ غرض تعلیم کے بغیر زندگی فضول ہے۔

سوال 2:- حکومت اور قوموں پر زوال کیسے آتا ہے؟

جواب:- حکومت اور قوموں کی ترقی کا راز تعلیم ہی میں مضمر ہے۔ جب حکومت اور قومیں جدید تعلیم سے بے توجہی اختیار کرتے ہیں اور خود کو اس قیمتی دولت سے دور رکھتے ہیں تو ان پر زوال آتا ہے۔

سوال 3:- شرافت اور عزت کا معیار کیا ہے؟

جواب:- تعلیم ہی شرافت اور عزت کا معیار ہے کیونکہ تعلیم ہی ایک ایسی دولت ہے جس کے حاصل کرنے سے انسان کی عزت اور شرافت میں بہتری آ سکتی ہے۔

سوال 4:- ترکِ تعلیم سے کیا کیا نقصانات ہیں؟

جواب:- تعلیم "ترک" کرنے کے بہت سارے نقصانات ہیں۔ تعلیم ترک کرنے سے ہی انسان زندگی کے ہر میدان میں پیچھے رہتا ہے۔ ترکِ تعلیم سے ہی حکومتوں کی حکومتیں زوال پذیر ہوتی ہیں۔ ترکِ تعلیم ہی انسان کو ترقی کرنے سے روکتی ہے۔ ترکِ تعلیم سے ہی لوگ زندگی کے مختلف شعبوں سے نااہل ہو جاتے ہیں۔

سوال 5:- کسی ملک اور وہاں کے عوام کی ترقی کن چیزوں سے ہو سکتی ہے؟

جواب:- کسی بھی ملک اور وہاں کے عوام کی ترقی جدید تعلیم کے حصول پر ہی منحصر ہے۔ جب کوئی ملک جدید تعلیم اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے پیش پیش چلتا ہے تو وہ ملک اپنے لئے ترقی کے میدان وسیع کر دیتا ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

سوالات: نظم: "نئی تہذیب" (اکبر الہ آبادی)

سوال 1:- اکبر نے نئی تہذیب کی کون سی برائیاں بتائی ہیں؟

جواب:- اکبر الہ آبادی نے نئی تہذیب کی کئی ساری برائیاں گنوائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نئی تہذیب میں شرم و حیا کی جگہ بے پردگی اور فحاشی آئے گی۔ شرافت اور زبان کا معیار ختم ہو جائے گا۔ زبان محض بازاری زبان بن کے رہ جائے گی۔ شریف اور بلند مرتبہ رکھنے والے لوگ بھی ختم ہو جائیں گے۔

سوال 2:- تقلید یورپ سے کیا مراد ہے؟

جواب:- تقلید یورپ سے مراد یورپ کی پیروی کرنا یعنی یورپ کا نقل کرنا ہے۔ ہندوستانی لوگوں نے یورپ کی تقلید کر کے اپنے ہر چیز کا معیار بدل ڈالا۔ اور ان ساری تبدیلیوں کا ان کو کوئی احساس نہیں ہے۔

سوالات: نظم: "بزمِ انجم" (ڈاکٹر سر محمد اقبال)

سوال 1:- عرشِ بریں سے آنے والی آواز کس کی تھی؟

جواب:- عرشِ بریں سے آنے والی آواز ایک فرشتے کی تھی۔

سوال 2:- قوموں کی زندگی میں کون سی منزل کٹھن ہوتی ہے؟

جواب:- قوموں کی زندگی میں کٹھن مرحلہ اسی وقت آتا ہے جب وہ ہر آن بدلتی ہوئی زندگی اور اس کے تقاضوں سے منہ موڑ لیتی ہے۔ پھر وہ قوم زوال پذیر ہوتی ہے۔

سوال 3:- زندگی کے سارے نظام کس سے قائم ہیں؟

جواب:- زندگی کے سارے نظام اتحاد و اتفاق اور امن سے ہی قائم رہتے ہیں۔

سوال 4:- منظر نگاری سے کیا مراد ہے؟

جواب:- کسی خاص واقعے یا کسی خاص حالت کی تصویر کھینچنے کو منظر نگاری کہتے ہیں۔

سوال 5:- اتفاق میں طاقت ہے نوٹ لکھئے؟

جواب:- اتفاق اور اتحاد کی بدولت قومیں ترقی کے منازل طے کر سکتی ہیں۔ اتفاق میں بے شک قوت اور طاقت ہے۔ گھر کے افراد میں اتحاد و اتفاق ہو تو وہ گھر ترقی کرتا ہے۔ اگر پتلی اور باریک سی لکڑی کی چھڑیوں کو اکٹھا کیا جائے تو انہیں توڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ایک ایک چھڑی کو الگ الگ کر کے توڑنا چاہیں تو وہ آسانی سے ٹوٹ جاتی ہیں۔ یہ مثال ثابت کرتی ہے کہ واقعی اتفاق میں اور اکٹھا رہنے میں طاقت ہوتی ہے۔

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar M.A B.Ed 7889726757

Scanned with CamScanner

سوالات: نظم: "کشمیر" (چکبست)

سوال 1:- شاعر نے اس نظم کشمیر کی صبح کا منظر کس طرح پیش کیا ہے؟

جواب:- شاعر نے اس نظم میں کشمیر کی صبح کا منظر ایک دلفریب انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ کشمیر کی صبح کا نظارہ قابلِ دید ہوتا ہے۔ صبح کے وقت پھول پہاڑوں پر اپنی خوشبو پھیلاتے ہیں اور پہاڑوں کی گھنی جھاڑیوں میں چنڈبال اپنی میٹھی بولی میں گاتی ہیں۔ آسمان کی سرخی اور اور سوسرخ گلابوں کی روشنی سے پہاڑ روشن اور چمکدار نظر آتے ہیں۔ آسمان پر ابر کے ٹکڑے مدہوشی میں جھومتے ہیں۔ صبح کی تازہ ہوا پھولوں کو ہلاتی ہے تو زمین پر پریوں کے ناز و انداز سے چلنے کا گمان ہوتا ہے۔

سوال 2:- شاعر کو کس چھوٹے ہوئے باغ کی یاد آتی ہے؟

جواب:- شاعر کا آبائی وطن کشمیر ہے۔ اُن کے بزرگ کشمیر سے ہجرت کر کے لکھنؤ چلے گئے۔ اس لئے شاعر کو کشمیر کی یاد آتی ہے۔ جو ایک باغ کی طرح خوش رنگ اور خوشبودار ہے۔

سوال 3:- کشمیر کی خاک سے کون کون سے "عالم و دانا" اٹھے ہیں؟

جواب:- کشمیر کی خاک سے متعدد عالم و دانا اٹھے ہیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: شیخ العالم، للہ دید، حبہ خاتون، شیخ حمزہ مخدومی، بلبل شاہ کشمیری، شیخ یعقوب صرفی اور ملا طاہر غنی کشمیری وغیرہ۔

سوالات: نظم: "پری محل" (شہ زور کاشمیری)

سوال 1:- شاعر کے نزدیک کشمیر میں بہار کی کیفیت ہوتی ہے؟

جواب:- شاعر کے نزدیک کشمیر کے موسمِ بہار کی کیفیت بہت دلنشین ہوتی ہے پانی کی ندیوں کا ناچ و نغمہ انسان کو دیوانہ بنا دیتا ہے۔ مست اور مدہوش بادل اور رنگ برنگے پھول قہقہوں کی طرح کھل کھلا کر سارے عالم کو نئی نویلی دلہن کی طرح سجاتے ہیں۔

سوال 2:- شاعر نے کشمیر کو گلکدہ کیوں کہا ہے؟

جواب:- شاعر نے کشمیر کو گلکدہ یعنی پھولوں کا چمن اس لئے کہا ہے کیونکہ یہاں ہر طرف رنگ برنگے اور خوشبودار پھول ہیں۔

NOTES

سوال 3:- مسدس سے کیا مراد ہے؟

جواب:- مسدس اس نظم کو کہتے ہیں جو چھ بندوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کے ہر بند کے ابتدائی چار مصرعوں میں ایک قافیے ہوتے ہیں اور باقی دو مصرعے الگ قافیے کے ہوتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

سوالات: نظم: "قبر" (اختر الایمان)

سوال 1:- شاعر نے رئیس کے بیٹے کی زبانی قبر کی زندگی کی کیا تفصیل بیان کی ہے؟

جواب:- شاعر نے رئیس کے بیٹے کی زبانی قبر کی تفصیل یوں بیان کی ہے کہ وہاں قبر میں ہمیں اکیلے جانا ہے جو ایک اندھیری کوٹھری ہے۔ وہاں کسی بھی آسائش کا انتظام نہیں ہے۔ وہاں کوئی بھی ہمدرد اور ساتھی نہیں ہوگا۔ وہاں ہر ایک چیز کے لئے ترسنا پڑتا ہے وہاں کی سب سختیاں اکیلے ہی برداشت کرنی پڑتی ہے۔

سوال 2:- غریب کے بچے کو قبر کی باتیں سن کر اپنا گھر کیوں یاد آتا ہے؟

جواب:- غریب کے بچے کو قبر کی باتیں سن کر اپنا گھر اس لئے یاد آتا ہے کیونکہ رئیس کے بیٹے نے قبر کی جو حالت بیان کی ہے وہ اس کے گھر سے موافقت رکھتی تھی یعنی غریب کا بھی کوئی ہمدرد اور مددگار نہیں ہوتا۔

سوال 3:- اس نظم کا آخری مصرعہ نکال دیا جائے تو سے نظم کے تاثر پر کیا اثر پڑے گا؟

جواب:- اس نظم کا آخری مصرعہ اگر نکال دیا جائے تو یہ ساری نظم محض ایک قصہ بن کر رہ جائے گا۔ کیونکہ اسی آخری مصرعے میں غریب کے گھر اور قبر کی دنیا میں رشتے کی معنویت ظاہر ہوتی ہے۔

سوال 4:- نظم معرا کسے کہتے ہیں؟

جواب:- نظم معرا اس نظم کو کہتے ہیں جس کے تمام مصرعے برابر کے ہوں مگر ان میں قافیہ کی پابندی نہ کی گئی ہو۔

Sunday 04

NOTES

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar M.A B.Ed 7889726757

Scanned with CamScanner

"مثنوی"

لغت کے اعتبار سے مثنوی کے معنی ہیں "دو دو" یا "دو جُزو والی چیز" یا اس کے معنی ہیں "دوہرا کرنا"۔ گرامر کے لحاظ سے مثنوی "مثنیٰ" سے مشتق ہے جس کے معنی بھی "دو دو" کے ہیں۔ اصطلاحِ شعر میں مثنوی اس نظم کو کہتے ہیں جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں مگر ہر شعر کا قافیہ مختلف ہو مگر بحر ایک ہوتی ہے۔ اس میں اشعار کی تعداد مقرر نہیں۔ مثنوی اردو ادب کی قدیم صنف شاعری ہے۔ اس میں ہر قسم کے خیالات کو روانی اور تسلسل کے ساتھ ادا کیا جا سکتا ہے۔ قدیم شعرائے ادب نے اس صنف کی طبع آزمائی کی ہے۔ اردو میں طویل اور مختصر دونوں طرح کی مثنویاں لکھی گئی ہیں۔ طویل مثنویوں میں میر حسن کی "سحر البیان" اور دیا شنکر نسیم کی "گلزارِ نسیم"، بہت مشہور ہیں۔

مثنوی کے لئے لازمی ہے کہ سب سے پہلے حمد لکھی جائے اور اس کے بعد اصلی مقصد بیان کیا جائے۔ غزل اور قصیدے کی طرح اس میں قافیے کی پابندی نہیں۔ اس میں مضمون مسلسل ہوتا ہے۔ مثنوی میں رزم و بزم، حسن و عشق، پند و نصیحت، مدح و ہجو، تصوف و فلسفہ، بادشاہوں اور امیروں کی تعریف، باغ، جنگل، بیابان، میدان، پہاڑ، کوئی تاریخی، اخلاقی مذہبی یا فرضی قصہ یا حکایت غرض ہر طرح کے مضامین آتے ہیں۔ مثنوی کا ہر مصرعہ دوسرے مصرعے سے ایسا ملنا چاہیئے جیسے ایک ڈھلی ہوئی زنجیر کی کڑیاں آپس میں ملتی چلی جاتی ہے اور کہیں سے ناہمواری ظاہر نہیں ہونے پاتی۔

غزل اور دیگر اصناف کے مقابلے میں مثنوی میں ایک الگ الگ طریقۂ اظہار کی بہت گنجائش ہے۔ اس میں ڈرامائی انداز، مرقع نگاری کی شاعری، طربیہ شاعری کی شگفتگی، حزنیہ شاعری کی معنی آفرینی، رزمیہ اور قصیدہ کا طمطراق (شان و شوکت) غزل کی دلگدازی غرض سب کچھ سما سکتا ہے۔ غزل کا آرٹ غنائی (نغمہ کا) اور مثنوی کا آرٹ توضیحی (کھول کے بیان کرنا) ہے۔

مثنوی کی خصوصیات:-

واقعات کا تسلسل اور ان کی ترتیب مثنوی کی اہم خصوصیات ہیں۔ یہ خصوصیت موجود ہو تو مثنوی کامیاب گنی جاتی ہے۔

واقعات نگاری اور اسلوب بیان:- واقعات کی بنیاد خواہ اصلیت پر ہو یا خیال پر وہ اس طرح بیان کئے جائے ان کی ایک ہو بہو تصویر سامنے آ جائے۔ مثنوی میں اُس دور کے رسم و رواج، بول چال اور طرزِ معاشرت کی عکاسی کی جاتی ہے جس دور میں یہ لکھی گئی ہو۔ اور جس ڈھنگ سے یہ عکاسی کی جائے اسے واقعہ نگاری کہتے ہیں۔ واقعہ خواہ کتنا ہی دلچسپ، مربوط اور پسندیدہ کیوں نہ ہو۔ اگر سلیقہ کے ساتھ بیان نہ کیا جائے تو بیکار ہو جاتا ہے۔ مثنوی کی مقبولیت کا دار و مدار زبان اور خوبصورت

M	T	W	T	F	S	S
1	2	3	4	5	6	7
8	9	10	11	12	13	14
15	16	17	18	19	20	21
22	23	24	25	26	27	28
29	30	31				

December 2014

M	T	W	T	F	S	S
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30	31	

January 2015

Tuesday 18 NOV 2014

322-043 • WK 47

پیرایۂ اظہار پر ہے۔ اردو کی بہترین مثنویاں وہی ہیں جن میں اسلوبِ بیان کی خوبیاں ملتی ہیں۔

9

کردار نگاری:۔ مثنوی میں سینکڑوں اشخاص کا ذکر آسکتا ہے۔ ان مختلف اشخاص کا

10 اخلاق، طرزِ زندگی، مزاج، گفتگو، رہن سہن وغیرہ مختلف ہوتا ہے۔ مثنوی کے تمام کرداروں کی امتیازی خصوصیات کو قائم رکھنا ضروری ہے۔

نواب مرزا شوق

حالاتِ زندگی :-

تصدق حسین نام نواب مرزا شوق کے تخلص نام سے جاتے ہیں۔ لکھنو کے ایک معزز گھرانے میں ۱۷۸۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندانی پیشہ طبابت تھا۔ وہ اپنے وقت کے مشہور حکیم تھے۔ اردو ادب میں ان کی شہرت ان کی مثنویوں کی بنا پر ہوئی۔ ۱۸۷۱ء کو اس دنیا کو خیرآباد کہا۔

شاعرانہ خصوصیات :-

نواب مرزا شوق کا نام اردو کے اہم مثنوی نگاروں میں ہوتا ہے۔ شاعری میں وہ آتش کے شاگرد تھے۔ ان کی شہرت کا باعث ان کی تین مثنویاں بنی ان میں دو مثنویاں "فریبِ عشق" اور "بہارِ عشق" ہیں اور تیسری مثنوی "زہرِ عشق" ہے جو سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔

زہرِ عشق ان کی ایک شاہکار مثنوی ہے۔ یہ ایک عشقیہ کہانی ہے۔ اس میں کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں ہے لیکن نظم میں اثر اور کیفیت اس قدر ہے کہ عشق و محبت کی ذرا ذرا سی باتیں بھی سچی اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس مثنوی کی اشاعت پر پابندی لگا دی گئی اور اسے پڑھنا عیب سمجھا جاتا تھا۔ یہ شاعر کا کمال ہے کہ سچائی کے ساتھ ان واقعات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ یہ مثنوی نہایت پراثر بن گئی ہے۔ دنیا کی ناپائیداری زہرِ عشق کے اس حصے سے لئے گئے اشعار ہیں جب ہیروئن خودکشی کرنے سے پہلے ہیرو سے ملاقات کرتی ہے اور اسے نصیحت کرتی ہے کہ یہ دنیا ناپائیدار ہے یہاں کسی بھی چیز کو ثبات حاصل نہیں ہے۔

NOTES

Scanned with CamScanner

April 2014

M	T	W	T	F	S	S
	1	2	3	4	5	6
7	8	9	10	11	12	13
14	15	16	17	18	19	20
21	22	23	24	25	26	27
28	29	30				

May 2014

M	T	W	T	F	S	S
			1	2	3	4
5	6	7	8	9	10	11
12	13	14	15	16	17	18
19	20	21	22	23	24	25
26	27	28	29	30	31	

خلاصہ:- مثنوی:- "دُنیا کی ناپائیداری" (نواب مرزا شوق)

"دنیا کی ناپائیداری" نواب مرزا شوق کی مشہورِ زمانہ مثنوی "زہرِ عشق" سے ماخوذ وہ حصہ ہے جس میں ہیروئن خودکشی کرنے سے پہلے ہیرو سے ملاقات کرتے وقت دنیا کی ناپائیداری کا احساس دلاتی ہے۔ شاعر نے دنیا کی ناپائیداری کا نقشہ نہایت موثر انداز میں کھینچا ہے۔ شاعر فرماتے ہیں کہ یہ دنیا جو ایک ختم ہونے والی اور مٹ جانے کی جگہ ہے۔ یہ محض ایک جائے عبرت ہے یعنی عبرت حاصل کرنے کی جگہ ہے۔ اور یہاں موت اچانک آکر ہر چیز کو دبوچ لیتی ہے۔ محبوبہ اپنے عاشق سے کہتی ہے کہ اس دنیائے فانی میں جن لوگوں کے اونچے اونچے مکان تھے وہ آج تنگ قبروں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس جہاں فانی میں کل تک جہاں پر پھول اور کلیاں اپنے جلوے دکھاتے تھے۔ آج وہاں کانٹوں اور کھنڈرات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ حالات یکسر بدلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس چمن میں بڑی تعداد میں بلبل چہکتے تھے وہاں آج الو بول رہے ہیں اور اپنے گھونسلے سجائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس دنیا میں جو کل انسان کل تک اپنی جوانی میں شان و شوکت اور آن بان میں مست تھے آج نہ وہ موجود ہے اور نہ ہی ان کی عالیشان عمارتوں کا کوئی نام و نشان ہے۔ اس دنیا میں کتنے حسین و جمیل انسان تھے جن کی خوبصورتی پر جنت کی حوریں بھی رشک کرتی تھی وہ سب مٹی میں مل چکے ہیں۔ ان میں اکثر لوگوں کے مکان مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو چکے ہیں اگر کوئی مکان موجود بھی ہے مگر ان میں رہنے والے موجود نہیں ہیں۔ اس دنیا میں بڑے بڑے بادشاہ تھے آج نہ ان کی حکومتیں ہیں اور نہ ہی ان کی قبروں کا کوئی نام و نشان موجود ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ بہرام خان جیسے پہلوان کی قبر کہاں ہے۔ رستم اور سام جیسے پہلوان جن کا بہت بڑا نام تھا۔ آج صرف ان کا نام ہے اور کچھ نہیں۔ اس دنیا میں جو بادشاہ سر پر تاج رکھتے تھے آج ان کا فاتحہ خوان بھی کوئی نہیں۔ مشہور و معروف شہر روم اور چین کے جو بادشاہ تھے آج ان کی قبروں کے نشان بھی موجود نہیں ہے اس دنیا میں جو لوگ حسنِ یوسف کی شہرت رکھتے تھے ان کا کوئی اتہ پتہ نہیں کہ انہیں آسمان کھا گیا یا زمین۔ یہ زمانہ اور وقت کا ہر لمحہ بدلنے اور پلٹنے والا ہے۔ غرض یہاں کسی بھی چیز کو پائیداری حاصل نہیں۔ یہاں کی ہر چیز مٹنے والی اور ختم ہونے والی ہے اور اسی کا نام دنیا ہے..........

Gumgeen Dar
Nowgam Shrari Sharief

سوالات: مثنوی :- "دُنیا کی ناپائیداری" (نواب مرزا شوق)

سوال 1 :- سرائے فانی سے کیا مراد ہے؟

جواب :- سرائے فانی سے مراد فنا ہونے والی جگہ یعنی دنیا ہے۔ یہاں کی ہر چیز پیدا ہونے کے بعد فنا ہو جاتی ہے اور آخر پر یہ دنیا بھی فنا ہو جائے گی۔

سوال 2 :- رشکِ یوسف سے کیا مراد ہے؟

جواب :- حضرت یوسف اللہ کے ایک پیغمبر تھے وہ انتہائی حسین و جمیل تھے۔ ان کے حسن پر پوری دنیا ناز کرتی تھی۔ حسنِ یوسف جیسا حسن دیکھنے والے جب حسنِ یوسف کو دیکھتے تھے انہیں بھی وہ حسن دیکھ کر رشک ہوتا تھا جسے رشکِ یوسف کہا گیا ہے۔

سوال 3 :- دنیا کی ناپائیداری پر پانچ جملے لکھئے؟

جواب :- اس دنیا میں کوئی بھی مستقل سکونت اختیار نہیں کر سکتا۔

اس دنیا کی ہر چیز فنا ہو جائے گی۔

اس دنیا میں کتنے بڑے بڑے بادشاہ آئے جن کا نام و نشان بھی موجود نہیں ہے۔

یہاں موت اچانک آ کر ہر چیز کو دبوچ لیتی ہے۔

اس دنیا میں جہاں بڑے بڑے مکان تھے وہاں آج کھنڈرات ہے۔

Notes Prepared By Sheraz Ahmad Dar M.A B.Ed 7889726757
Gumgeen Dar
Nowgam Shrari Sharief
Gumgeen Dar
Nowgam Shrari Sharief
PRINCIPAL
Memorial Modern School
NOTES
Scanned with CamScanner